شہر کی خاطر
نظیر صدیقی
کتاب گھر۔ ڈھاکا

شہرت کی خاطر

انشائیوں کا مجموعہ

نظیر صدیقی

پاک کتاب گھر۔ ۳۹ پٹوا ٹولی۔ ڈھاکا ۱

ناشر	پاک کتاب گھر ڈھاکا
طابع	عارفین پریس ڈھاکا
کاتب	عثمان احمد بدایونی
پہلی اشاعت	اپریل ۱۹۶۱ء
قیمت	تین روپے پچاس پیسے

فہرست مضامین

کچھ اپنے فن کی تعریف میں

اس کتاب کے مضامین ادب کی اُس صنف سے تعلق رکھتے ہیں جسے انگریزی میں ایسّے (ESSAY) کہتے ہیں۔ اردو میں ایسّے کے لئے کوئی ایسی اصطلاح نہیں جسے سب لوگ متفقہ طور پر استعمال کرتے ہوں۔ ہماری زبان میں ادب کی اس صنف کے لئے مختلف نام تجویز کئے جاتے رہے ہیں۔ مثلاً اکثر لوگ اسے مزاحیہ اور طنزیہ مضمون کہتے رہے ہیں۔ بعض نے اسے انشائے لطیف کہا ہے۔ کسی نے اس کا نام لطیف پارہ رکھا۔ اور بعض نے انشائیہ۔ ذاتی طور پر میں انشائیہ کی اصطلاح کو دوسری اصطلاحات پر ترجیح دیتا ہوں۔ لیکن اس وقت تک یہ اصطلاح بھی عام طور پر رائج نہیں۔

انگریزی ادب میں لفظ ایسّے سنجیدہ اور ہلکے پھلکے (Light) دونوں قسم کے مضامین کے لئے استعمال ہوتا رہا ہے۔

چنانچہ انگریزی Essays کے ہر انتخابی مجموعے میں دونوں قسم کے مضامین نظر آتے ہیں۔ پھر بھی انگریزی میں جب کبھی اور جہاں کہیں انشایئے کی تعریف یا اس کے تصور سے بحث ہوتی ہے وہاں عموماً Light Essay ہی پیش نظر ہوتا ہے نہ کہ علمی اور تنقیدی مقالہ لیکن انگریزی میں Light Essay کی ترکیب یا اصطلاح کہیں دیکھنے میں نہیں آئی۔ البتہ مجھے جے۔ بی۔ پریسٹلی پر آئیور براؤن کے ایک مضمون میں Personal Essays کی اصطلاح ضرور ملی۔

لفظ انشایئے۔ فرانسیسی زبان کی دین ہے۔ عام طور پر ادب کی اس صنف کا موجد فرانسیسی ادیب مونیتن مانا جاتا ہے۔ مونیتن سے لے کر دور حاضر تک کے انشائیہ نگاروں اور انشا پردازوں نے انشایئے کے بارے میں جو کچھ کہا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس اصطلاح سے ان لوگوں کا مقصود علمی یا تنقیدی مضمون نہیں بلکہ Light Essay یا Personal Essay رہا ہے۔ مثلاً مونیتن نے اپنے مضامین کے بارے میں کہا تھا کہ "میں جس کی تصویر کھینچتا ہوں وہ خود میں ہوں۔" ڈاکٹر جونسن نے انشایئے کو دماغ کی آزاد ترنگ

(LOOSE SALLY OF MIND) قرار دیا تھا۔ ہنلی (HENLEY) نے
اسے گفتاری ادب گردانا ہے۔ رابرٹ لنڈ (ROBERT LYND)
نے کہا ہے کہ "ہم میں سے اکثر لوگ بہترین ایسے کو عام گفتگو کی
بجائے نجی گفتگو سمجھتے ہیں" GREAT ESSAYS OF ALL NATIONS کے
مرتب ایف۔ ایچ۔ پریچرڈ نے اس صنف کے لیے HOMELY AND
UNPRETENTIOUS کی صفات استعمال کی ہیں۔ دورِ حاضر کے مشہور
انگریزی انشائیہ نگار HILAIRE BELLOC کے انشائیوں کے مرتب
جے۔ بی۔ مورٹن نے ایسے کی تعریف یوں کی ہے کہ "ایسے نثر کا
ایک ایسا چھوٹا سا ٹکڑا ہے جس میں مصنف دنیا کے کسی بھی موضوع
کے باب میں اپنی ذات کا انکشاف کرتا ہے"۔ آگے چل کر مورٹن
لکھتا ہے کہ ایسے شدید طور پر ادب کی شخصی صنف ہے۔ لیکن
ایسے کی اس تعریف و تصور کے باوجود انگریزی میں ESSAYS
کے بیشتر انتخابی مجموعے ایسے ہیں جو سنجیدہ علمی اور تنقیدی
مضامین سے خالی نہیں۔ انگریزوں کی یہ بوالعجبی میری سمجھ
میں نہیں آتی کہ جب یہ قوم ایسے کی اصطلاح سے LIGHT
یا PERSONAL ESSAY مراد لیتی ہے تو ESSAYS کے
انتخابی مجموعوں میں علمی اور تنقیدی مضامین کیوں شامل کر لیتی ہے۔

روبرٹ لنڈ جو دور حاضر کے ممتاز ترین انشائیہ نگاروں میں شمار کیا جاتا ہے اس نے انگریزی ادب میں صرف بیکن اور چارلس لیمب کے مضامین کو ایسے کی صنف میں کلاسکس کا درجہ دیا ہے۔ ان دونوں کے کلاسکس ہونے میں کیا شبہ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر ایسے کے معنی LIGHT یا PERSONAL ESSAY کے ہیں تو کیا بیکن کے ESSAYS کو بھی LIGHT یا PERSONAL ESSAYS کہہ سکتے ہیں۔ اس سوال کا جواب جو بھی ہو لیکن یہ واقعہ ہے کہ عام طور پر ESSAY کی اصطلاح سے PERSONAL ESSAYS مراد لئے جاتے ہیں اور ESSAYIST اسی شخص کو کہا جاتا ہے جو PERSONAL ESSAYS لکھتا ہے۔ اس بنا پر میرا خیال ہے کہ ESSAYS کے انتخابی مجموعوں میں علمی، تاریخی اور فلسفیانہ مضامین ہرگز شامل نہیں کرنے چاہئیں۔ اور اس قسم کے مضامین لکھنے والوں کو انشائیہ نگاروں (ESSAYISTS) میں شمار کرنے کی بجائے انہیں ان کے موضوعات کے اعتبار سے نقاد، مورخ اور مفکر کہنا چاہیئے۔

جیسا کہ اوپر کی سطروں میں کہا گیا لفظ ایسے۔ فرانسیسی زبان

کی دین ہے اور عام طور پر ادب کی اس صنف کا موجد مونتین کو تسلیم کیا جاتا ہے جو سولہویں صدی کا ادیب تھا۔ لیکن ۔ great ESSAYS OF ALL NATIONS کے مرتب ایف۔ ایچ۔ پریچرڈ مونتین کو اس صنف کا موجد نہیں مانتا اس کے نزدیک ایسّے ادب کی قدیم ترین اصناف میں سے ہے اور اس میں شک نہیں کہ اس نے اپنی مذکورہ بالا کتاب میں دنیا کی ۲۶ زبانوں کے ادب سے جو ESSAYS انتخاب کئے ہیں اُن کے پیش نظر اس کا دعویٰ غلط نہیں۔ جہاں SERIOUS ESSAY کے ابتدائی نمونے افلاطون وارسطو کی تحریروں میں ملتے ہیں وہاں LIGHT ESSAY کے ابتدائی نمونے ارسطو کے معاصر و مقلد تھیو فراسٹس (THEOPHR ASTUS) کے خاکوں (CHARAC TERS) میں دیکھے جا سکتے ہیں۔

غرضکہ ایسّے کی اصطلاح علمی اور فکری مضمون کے معنی میں استعمال کی جائے یا انشائیہ کے معنی میں بہرصورت یہ کوئی نئی یا نوعمر صنف ادب نہیں۔ بقول بیکن لفظ ایسّے نیا ہے لیکن اس سے جو چیز مقصود ہے وہ پرانی ہے۔ جہاں تک انشائیے (PERSONAL ESSAY) کا تعلق ہے ادب کی یہ صنف اپنی پیدائش اور عمر کے اعتبار سے جس قدر بھی پرانی ہو۔ لیکن میرا خیال ہے کہ اسے

جو اہمیت اور مقبولیت بیسویں صدی میں حاصل ہوئی وہ پہلے کبھی نہ ہوئی ہوگی۔ انگریزی ادب میں اس کی مقبولیت کا بہترین دور بیسویں صدی کی تیسری دہائی تھا۔ اس زمانے میں ادب کی یہ صنف انگریزی صحافت کا لازمی جزو بن گئی تھی۔ ہر اخبار کے درمیانی صفحات میں ایک دو انشائیے ضرور ہوتے۔ جیسا کہ آیوُر براؤن نے لکھا ہے۔ اخباروں کے بیچ میں جگہ پانے کی رعایت سے لوگ انشائیوں کو MIDDLES بھی کہنے لگے۔ کتب فروشوں کی فہرستوں میں انشائیوں کے مجموعوں پر BELLES - LETTRES کا لیبل لگا ہوتا۔ رفتہ رفتہ BELLES-LETTRES کی اصطلاح حقارت آمیز اصطلاح بن گئی۔ قارئین کی نئی نسل انشائیوں کو جو زندگی کے لطف و لذت سے متعلق ذاتی اعترافات و اعلانات پر مشتمل ہوتے تھے۔ قدرے مصنوعی چیز تصور کرنے لگی۔ ادھر ایک مدت سے انگریزی ادب میں انشائیہ نگاری مقبول نہیں۔ لیکن چونکہ انگریزی اور مغربی ادب کی اصناف و تحریکات انگریزی اور مغربی ادب میں عمر طبیعی کے گذرنے کے بعد اردو ادب میں ظہور پذیر یا مقبول ہوتی ہیں اس لئے ادھر تین چار سال

سے اردو ادب میں انشائیہ نگاری کا بازار گرم ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ اردو ادب میں انشائیہ جدید ترین صنف ادب کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہاں میں اردو ادب میں انشائیہ نگاری کی تاریخ بیان کرنا نہیں چاہتا خصوصاً اس لئے کہ مجھے اردو ادب کی کسی بھی صنف کی تاریخ معلوم نہیں۔ پھر بھی یہ دعویٰ کرنا شاید غلط نہ ہوگا کہ انیسویں صدی کے آخر میں مغرب کے اثر سے جن چیزوں کے ابتدائی نقوش اردو ادب میں ابھرے ان میں انشائیہ بھی ہے۔ سرسید کا مضمون "امید کی خوشی" منشی سجاد حسین اور اودھ پنچ کے دوسرے قلمی معاونین کے مزاحیہ خاکے اردو میں انشائیہ نگاری کے پیش رو کہے جا سکتے ہیں۔ شرر لکھنوی، سجاد حیدر یلدرم، خواجہ حسن نظامی مرزا فرحت اللہ بیگ، رشید احمد صدیقی، پطرس بخاری، شوکت تھانوی کنھیا لال کپور، شفیق الرحمن کرشن چندر، سعادت حسن منٹو، ابراہیم جلیس امجد حسین وزیر آغا ان تمام ادیبوں کے یہاں اچھے اور قابل قدر انشائیے ملتے ہیں۔ انیسویں صدی کے آخر سے لے کر اس وقت تک اردو ادب میں انشائیہ نگاری کی کوئی باقاعدہ روایت ہو یا نہ ہو مگر اردو ادب میں اس صنف سے دلچسپی رکھنے والے اور اسے فروغ دینے کی کوشش کرنے والے ضرور نظر آتے ہیں۔ گذشتہ تین چار سال سے

اردو انشائیہ نگاری کے میدان میں کئی نئی صلاحیتیں کارفرما ہیں۔ ان میں سے بعض کے انشائیوں کے مجموعے بھی شائع ہو چکے ہیں۔ لیکن ابھی ان کے متعلق کسی قسم کی رائے زنی قبل از وقت ہوگی۔

آج کل اردو ادب میں انشائیے کے فن سے جس قدر دلچسپی کا اظہار کیا جا رہا ہے اس کے باوجود مجھے کچھ ایسا محسوس ہوتا رہا ہے جیسے اکثر لوگوں کے ذہنوں میں اس فن کا صحیح اور واضح تصور موجود نہیں۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ اکثر لوگ انشائیہ کو مزاح نگاری اور طنز نگاری کا مترادف سمجھتے ہیں۔ انشائیہ عموماً طنز و مزاح کے عناصر سے خالی نہیں ہوتا پھر بھی اسے طنز نگاری یا مزاح نگاری کا مترادف سمجھنا صحیح نہیں۔ انگریزی ادب میں ممتاز انشائیہ نگاروں کے بہت سے انشائیے ایسے بھی ہیں جن میں طنز و مزاح کے عناصر بہت کم ہیں یا بالکل نہیں پھر بھی ان کے اچھے اور معیاری ہونے سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ رابرٹ لنڈ نے ایک جگہ لکھا ہے کہ "ہم انشائیے سے صرف اتنا ہی چاہتے ہیں کہ وہ اپنے طرز تحریر سے ہمیں خوش کرے اور اپنے موضوع کو اختصار کے ساتھ کسی قدر نئی روشنی میں پیش کرے"

دنیا میں کوئی فن ایسا نہیں جس کی جامع اور مانع تعریف بسا اوقات

محال کی حد تک مشکل نہ مانی گئی ہو۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں میں انشائیے کی کوئی تعریف پیش کرنے کے تیار نہیں۔ لیکن اگر مجھ سے پوچھا جائے کہ انشائیہ کیا ہے تو میرا جواب یہ ہوگا کہ انشائیہ ادب کی وہ صنف ہے جس میں حکمت سے لے کر حماقت تک اور حماقت سے لے کر حکمت تک کی ساری منزلیں طے کی جاتی ہیں۔ یہ وہ صنف ادب ہے جس میں بے معنی باتوں میں معنی تلاش کئے جائے گیا اور بامعنی باتوں کی مہملیت اور مجہولیت اجاگر کی جاتی ہے یعنی SENSE میں NONSENSE اور NONSENSE میں SENSE ڈھونڈا جاتا ہے۔ یہ وہ ادبی صنف ہے جس میں لکھنے والا غیر سنجیدہ ہونے کے باوجود سنجیدہ ہوتا ہے۔ اور سنجیدہ ہونے کے باوجود غیر سنجیدہ۔ یعنی بالفاظ غالبؔ لکھنے والے کی بیخودی میں ہشیاری اور ہشیاری میں بیخودی پائی جاتی ہے۔ یہ ادب کی وہ صنف ہے جس میں کہیں سچ میں جھوٹ کی آمیزش ہوتی ہے اور کہیں جھوٹ میں سچ کی۔ یہ وہ صنف ادب ہے جس میں نہ صرف اپنا نام اور دوسروں کی پگڑی اچھالی جاتی ہے بلکہ اپنی پگڑی اور دوسروں کے نام بھی۔ یہ وہ صنف ادب ہے جس میں لکھنے والا نہ صرف دوسروں کی کمزوریوں پر ہنستا ہے بلکہ اپنی کمزوریوں پر دوسروں کو بھی ہنسنے کا موقع دیتا ہے۔

یہ وہ صنف ادب ہے جس میں تفریح اور تنقید ایک دوسرے سے بغل گیر نظر آتی ہیں اور بصیرت و ظرافت ایک دوسرے کی سگی بہنیں معلوم ہوتی ہیں۔ یہ وہ صنف ادب ہے جس میں عنوان اور نفس مضمون میں وہی نسبت ہے جو کھونٹی اور لباس میں ہے۔ یہ وہ صنف ادب ہے جس میں عنوان کا مضمون سے مربوط ہونا اتنا ضروری نہیں جتنا مضمون کا مضمون نگار سے متعلق ہونا ضروری ہے۔ یہ وہ صنف ادب ہے جس میں اسلوب کا دل نشیں ہونا اتنا ہی ضروری ہے جتنا خیالات کا دل چسپ ہونا۔ یہ وہ صنف ادب ہے جس میں لکھنے والا کومن سینس اور کلچر سے اپنے ظاہری انحراف کے باوجود ان کی اشاعت میں حصہ لیتا ہے۔ یہ وہ صنف ادب ہے جس میں حماقت کی باتیں کرنے کی اجازت ہے۔ لیکن حماقت کی باتوں پر اکتفا کرنے کی اجازت ہرگز نہیں۔ دوسرے لفظوں میں یوں سمجھیئے کہ یہ وہ صنف ادب ہے جس میں IDIOSYNCRACY اور WHIM ، FANCY ان تمام چیزوں کو راہ دی جا سکتی ہے لیکن جن چیزوں کی بنا پر کسی انشائیہ نگار کو اونچا رتبہ حاصل ہوتا ہے وہ IDIOSYNCRACY اور WHIM/FANCY نہیں بلکہ زندگی اور انسانی فطرت پر وہ تنقید ہے جو دونوں کے گہرے مشاہدے اور مطالعے پر مبنی ہوتی ہے۔ غالباً انشائیہ کے

اسی پہلو پر زور دینے کے لئے ایف۔ ایچ پریچرڈ نے کہا تھا کہ "اگر آپ انشائیہ نگار کے مقصد کو سمجھتے ہیں تو خیر۔ اگر نہیں سمجھتے اور اس کے تمسخر اور الفاظ کے ظاہری کھیل سے لطف اندوز ہونے پر اکتفا کر لیتے ہیں تو اس میں نقصان آپ کا ہے۔"

اب کچھ اپنے انشائیوں کے بارے میں ——— اس باب میں سب سے پہلے اس بات کا اعتراف ضروری معلوم ہوتا ہے کہ میں جن حالات و حوادث سے گذرتا رہا ہوں ان کے اثر سے میری زندگی بڑی حد تک غم و غصہ کا شکار رہی ہے۔ یہی غم و غصہ میری شاعری اور میرے انشائیوں کے محرکات رہے ہیں۔ میری شاعری کا محرک غم ہے اور میرے انشائیوں کا محرک غصہ۔ یہی وجہ ہے کہ میرے انشائیوں میں مزاح سے زیادہ طنز کا عنصر نمایاں ہے۔ بقولِ جیمز سدرلینڈ "اس بات میں شک کرنے کی کوئی وجہ نہیں کہ بیشتر طنز بدی یا حماقت پر دیانت دارانہ غصہ کا نتیجہ ہوتی ہے۔" یہاں میں طنز و مزاح کے متعلق ایک دو باتیں کہے بغیر آگے نہیں بڑھ سکتا۔ مجھے کچھ ایسا محسوس ہوتا رہا ہے کہ عام تعلیم یافتہ طبقہ طنز و مزاح کے لطیف فرق سے واقف نہیں۔ دراصل اس فرق کو سمجھنا اتنا آسان بھی نہیں جتنا بظاہر نظر آتا ہے۔ چنانچہ عوام کا تو ذکر ہی کیا ہے اس معاملے میں بعض اوقات خواص بھی دھوکا

کہا جاتے ہیں۔ جیمز سدرلینڈ نے صحیح کہا ہے کہ اصولی یا نظری طور پر مزاح اور طنز میں تمیز کرنا زیادہ دشوار نہیں۔ لیکن مصیبت وہاں سے شروع ہوتی ہے۔ جہاں سے ہم کسی خاص ادیب کی تصانیف پر غور کرنے لگتے ہیں۔ اگر ہم اس بات کو مان لیں کہ جو چیز طنز نگار کو مزاح نگار سے متاثر کرتی ہے وہ اس کا مقصد ہے ـــــ اور طنز نگار کا مقصد برائیوں اور کمزوریوں کو بے نقاب کرنا ان کا مضحکہ اڑانا اور ان کی مذمت کرنا ہے ـــــ تو ہم دیکھیں گے کہ جن تحریروں کو تنقیدی طور پر مزاحیہ کہا جاتا رہا ہے۔ ان میں سے بہت سوں کو طنزیہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ جیسا کہ جیمز سدرلینڈ نے اپنی بصیرت افروز تصنیف ENGLISH SATIRE میں بتایا ہے مزاح اور طنز کے فرق کو پہچاننے میں دشواری اس لئے بھی ہوتی ہے کہ بعض اوقات مزاح نگار کے ہاتھ سے اخلاقی غیر جانبداری کا دامن چھوٹ جاتا ہے اور وہ طنز کی حدود میں پھسل آتا ہے اور بعض اوقات طنز نگار اپنے قارئین پر اپنی گرفت کو ڈھیل دے کر مزاح کے سائے میں سستانے لگتا ہے۔ بہرحال مزاح نگار اور طنز نگار کے درمیان بنیادی فرق یہ ہے کہ اگرچہ دونوں کا موضوع انسانی کمزوریاں اور کوتاہیاں ہیں لیکن مزاح نگار ان کمزوریوں اور کوتاہیوں کو نہ صرف برداشت

کرتا ہے بلکہ ان سے دل چسپی لیتا اور لطف اٹھاتا ہے۔ اس کے
برعکس طنز نگار ان کمزوریوں اور کوتاہیوں کے خلاف نہ صرف
احتجاج کرتا ہے بلکہ وہ ان کی اصلاح کرنے اور غلط کام کرنے والوں
کو سزا دینے کے درپے رہتا ہے۔ انسانی کمزوریوں اور کوتاہیوں کے
باب میں مزاح نگار کی حیثیت تماشائی یا زیادہ سے زیادہ
(COUNSEL FOR THE DEFENCE) کی ہوتی ہے اور طنز نگار
سرکاری وکیل کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ طنز نگار بسا اوقات
کسی معاملے کے ایک رخ کو نمایاں کرتا ہے یا ایک رخ کو نمایاں
کرنے کے لیئے بات کو گھٹا بڑھا کے یا توڑ مروڑ کے پیش کرتا ہے لیکن
اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا صحیح نہ ہوگا کہ وہ انسانی زندگی اور انسانی
تعلقات کی پیچیدگیوں سے ناآشنا ہے یا کسی صورت حال
کے تمام پہلوؤں (TOTALITY OF A SITUATUN) پر نظر نہیں
رکھتا۔ دراصل وہ اپنے مقصد کے حصول کے لیئے ہر ذریعے کو روا رکھتا
ہے۔ طنز کو سمجھنے اور اس سے لطف اندوز ہونے کے لیئے قاری میں
ذہانت وفطانت کا ہونا ضروری ہے۔ اس سلسلے میں جیمز سدرلینڈ
نے صاف صاف کہہ دیا ہے کہ طنز اُن لوگوں کے لیئے ہے ہی نہیں جو
تخیل وطباعی سے عاری ہیں۔ کند ذہن لوگ اول تو طنزیہ ادب پڑھتے

ہی نہیں اور اگر پڑھتے ہیں تو اس کا مطلب کچھ کا کچھ سمجھ لیتے ہیں۔

جیسا کہ عرض کر چکا ہوں انشائیہ نگاری، مزاح نگاری اور طنز نگاری کا مترادف نہیں۔ اس لحاظ سے کسی انشائیہ نگار کو دوسرے لفظوں میں مزاح نگار یا طنز نگار کہنا صحیح نہیں۔ ویسے ایک انشائیہ نگار مزاح نگار بھی ہو سکتا ہے۔ لیکن ہر مزاح نگار یا طنز نگار کا انشائیہ نگار ہونا ضروری نہیں کیوں کہ طنز اور مزاح ادب کی صنف نہیں صفت ہیں۔ اس بنا پر عین ممکن ہے کہ کوئی شخص اپنے ادب کی نمایاں صفت کے اعتبار سے مزاح نگار ہو لیکن اپنے ادب کی صنف کے اعتبار سے ناول نگار یا ڈراما نگار ہو۔ ایک مرتبہ میرے ایک پڑھے لکھے دوست مجھ سے یہ سوال کر بیٹھے کہ تمہارے انشائیوں میں طنز کا عنصر نمایاں ہے تو تمہیں انشائیہ نگار کی بجائے طنز نگار کیوں نہ کہا جائے۔ میں نے جواب دیا کہ اگر آپ مجھے بیک وقت انشائیہ نگار اور طنز نگار مان لیں تو اس میں کیا قباحت ہے۔ میں ادب کی جس صنف کو استعمال کرتا ہوں اس لحاظ سے یقیناً انشائیہ نگار ہوں اور اگر میرے انشائیوں کا نمایاں عنصر طنز ہے تو اس صفت کی بنا پر میں طنز نگار بھی کہلا سکتا ہوں۔

میری شاعری جس غم کی ترجمان ہے وہ بڑی حد تک شخصی اور

داخلی ہے۔ اس بنا پر میں کبھی کبھی اپنے بارے میں سوچا کرتا تھا کہ میں بالکل داخلیت پسند (INTROVERT) تو نہیں لیکن جب سے میں نے انشائیہ لکھنا شروع کیا ہے مجھے محسوس ہونے لگا ہے کہ میں زندگی کے خارجی اور اجتماعی پہلوؤں سے بھی دل چسپی لینے کی صلاحیت رکھتا ہوں۔ میرے انشائیے زندگی کے خارجی اور اجتماعی معاملات سے میری دل چسپی اور اُن کی طرف میرے رویے دونوں کے اظہار ہیں۔

اس مجموعے کے تقریباً سارے انشائیے حلقۂ اربابِ ذوق، ڈھاکا کے جلسوں میں پڑھے جا چکے ہیں۔ ان پر حلقے کی روایت کے مطابق اچھی بری، صحیح غیر صحیح، موافقانہ اور غیر موافقانہ ہر قسم کی تنقیدیں ہوئیں۔ اور اگر میرا اندازہ غلط نہیں تو غیر موافقانہ تنقیدیں زیادہ ہوئیں در اصل حلقہ ہے ہی ایسی جگہ جہاں سے شیکسپیر اور دانتے بھی صحیح سلامت بچ کر نہیں جا سکتے تھے اور اگر چسٹرٹن اور روبرٹ لنڈ جیسے انشائیہ نگار بھی وہاں اپنے انشائیے پڑھتے تو ان کا انجام میرے لیے کچھ زیادہ قابلِ رشک نہ ہوتا۔ عین ممکن تھا کہ اگر کوئی صاحب چسٹرٹن کے انشائیوں کے قولِ محال اور روبرٹ لنڈ کے انشائیوں کی سادگی کی داد دیتے تو دوسرے صاحب یہ فرما دیتے کہ اس میں شک نہیں کہ چسٹرٹن کے قولِ محال نہایت خیال انگیز ہیں لیکن

رچلنے والوں کا لفظ 'لیکن' سے بڑا گہرا تعلق ہے) ان کے انشائیے کی دل چسپی شروع سے آخر تک یکساں طور پر قائم نہیں رہتی اور جہاں تک رابرٹ لنڈ کے مضمون میں سادگی کا تعلق ہے اس کی دل کشی سے انکار نہیں کیا جاسکتا لیکن ان کا انشائیہ سنتے وقت رہ رہ کر یہ خیال میرے ذہن میں آرہا تھا کہ کہیں یہ سادگی سطحیت کا نتیجہ تو نہیں۔ پھر یہ کہ جہاں تک رابرٹ لنڈ کے موضوع کا تعلق ہے وہ نہایت فرسودہ ہے اور اس کے متعلق جو باتیں انہوں نے کہی ہیں وہ بھی نئی نہیں۔ رابرٹ لنڈ کے انشائیے میں عنوان اور نفس مضمون کے درمیان کوئی ربط نظر نہیں آتا۔ ان کے انشائیے کا عنوان سن کر جو توقعات میرے ذہن میں پیدا ہوئی تھیں۔ وہ بھی پوری نہ ہوسکیں۔ میں سمجھتا تھا کہ وہ اپنے انشائیہ 'لمبے آدمی' میں یہ بتائیں گے کہ آدمی لمبے کیوں ہوتے ہیں۔ مگر انہوں نے دکھایا یہ ہے کہ لمبے آدمی عموماً افسردہ خاطر رہا کرتے ہیں۔ لمبے آدمی پر جس پس منظر میں گفتگو کرنی چاہیے تھی اسے انہوں نے پیش نظر نہیں رکھا۔ صرف اتنا ہی نہیں بلکہ لمبے آدمی کے بہت سے پہلو اس مضمون میں آئے ہی نہیں۔ لمبے آدمی کا مسئلہ دراصل بین الاقوامی مسئلہ ہے لیکن رابرٹ لنڈ نے اسے ذاتی مسئلہ بنا دیا ہے۔ معلوم نہیں وہ اپنی ذات کو اتنی اہمیت کیوں دیتے ہیں۔ چوں کہ ان کے

مضمون میں مزاح برائے نام ہے اس لئے اسے انشائیہ کہنے کی بجائے مقالہ کہنا زیادہ صحیح ہو گا۔ وغیرہ وغیرہ۔

حلقے کے جلسوں میں اس قسم کی تنقیدوں سے مجھے سابقہ پڑ چکا ہے اور اس سے بھی بڑی بات یہ ہوئی ہے کہ بعض حضرات میری انشائیہ نگاری کی صلاحیت سے اس درجہ مایوس ہوئے کہ انہوں نے حلقے کے جلسوں میں۔ صرف تنقید کو کافی نہیں سمجھا بلکہ جلسے کے بعد مجھے دوستانہ انداز میں یہ مخلصانہ مشورہ بھی دیا کہ اگر میں اپنی ادبی سرگرمیوں کو تنقید نگاری تک محدود رکھوں تو بہتر ہو گا ان باتوں کے ذکر سے میرا مقصد حلقہ اور ارباب حلقہ کی تضحیک نہیں۔ یہاں کا حلقہ میرے بزرگوں اور میرے دوستوں سے عبارت تھا جن کی قابلیت، صلاحیت اور ذہانت کا میرے دل میں اعتراف بھی ہے اور احترام بھی۔ یہ اور بات کہ بعض اوقات میں ان کی رایوں کا احترام کرنے سے قاصر رہا ہوں۔ خیر تو کہنے کی بات یہ ہے کہ حلقے کے جلسے میں میرے انشائیوں پر جو اعتراضات ہوئے ان میں سے ایک اعتراض یقیناً لائق توجہ ہے وہ یہ کہ میرے انشائیوں میں کلبیت (CYNICISM) پائی جاتی ہے۔ میں اس اعتراض کو اعتراض کے طور پر نہیں بلکہ اپنے نقطۂ نظر کی ایک اہم خصوصیت کے طور پر تسلیم کرتا ہوں۔ اگر میرے انشائیے میری کلبیت کے غماز ہیں تو میں

اس کے لئے کسی سے شرمندہ نہیں۔ ترقی پسندوں سے بھی نہیں۔ میں اگر مکمل طور پر نہیں تو بڑی حد تک کلبیت پسند ضرور ہوں۔ کلبیت پسند ہی نہیں قنوطیت پسند (PESSIMIST) بھی کارناموں اور کمالوں کے اعتبار سے انسان کو اشرف المخلوقات ماننے کے باوجود مجھے وہ اتنی بلند و برگزیدہ مخلوق نہیں معلوم ہوتا جتنا انسان پرستوں کے قصائد ظاہر کرتے ہیں۔ اس کی ازلی حماقتوں اور شقاوتوں (یہ واقعہ ہے کہ ہر دور میں انسانوں کی اکثریت نے احمق اور شقی القلب ہونے کا ثبوت دیا ہے) کی جو لرزہ خیز داستانیں تاریخ کے اوراق میں محفوظ ہیں۔ اور جن حماقتوں اور شقاوتوں سے پیدا ہونے والے المیے میں اس دور کے لوگ مبتلا ان کے پیش نظر کوئی وجہ نہیں، کم از کم میرے لئے ممکن نہیں کہ میں انسان سے اُس قسم کا عشق کروں جس قسم کا عشق ترقی پسند حضرات فرماتے ہیں اور انسان سے ویسی عقیدت رکھوں جیسی عقیدت وہ رکھتے ہیں۔ عشق کرنا تو ایک طرف میں تو ایسی مخلوق سے نفرت کئے بغیر بھی نہیں رہ سکتا۔ یہ اور بات کہ میں خود اسی مخلوق کے افراد میں سے ہوں۔ انسان پر قدرت کا یہی ظلم کم نہ تھا کہ اسے اشرف المخلوقات بنانے کے باوجود اس کے جسم کو ایسی کثافتوں کا حامل بنایا جو حد درجہ مضحکہ خیز بھی ہیں اور کراہت انگیز بھی۔ ستم

بالا نے ستم یہ کہ اس کی فطرت میں وہ کمزوری بھی رکھ دی جس کی طرف غالب نے یوں اشارہ کیا ہے ؎

جانتا ہوں ثواب طاعت و زاہد
پر طبیعت ادھر نہیں آتی

غالب نے انسان کی جبس عنصری اور عضوی کمزوری کی طرف اشارہ کیا ہے اس کی بنا پر اس دنیا کا مائل بہ شر ہونا تعجب کی بات نہیں۔ البتہ تعجب کی بات یہ ہے کہ اس حقیقت کا اعتراف کرنے والے کو توہین آمیز طور پر کلبی اور قنوطی کہا جاتا ہے۔ اگر ایک بے رحم حقیقت کا اعتراف، و اظہار کلبیت اور قنوطیت ہے تو مجھے کلبی اور قنوطیت پسند ہونے پر فخر ہے۔ یہ جاننے کے باوجود کہ کسی کلبی اور قنوطیت پسند پر کسی ترقی پسند کو فخر نہیں ہوتا۔ میرا خیال ہے کہ جو ترقی پسندی حقیقت پسندی کے منافی ہو اس سے وہ کلبیت اور قنوطیت پسندی ہزار درجہ بہتر ہے جو زندگی کے تلخ و تاریک حقائق کے ادراک و اعتراف میں معاون ثابت ہو۔

اپنی کلبیت اور قنوطیت کے باوجود یعنی نوع انسان کو نفرت و حقارت کی نگاہ سے دیکھنے اور دنیا کو مائل بہ شر ماننے کے باوجود میں صاحب اوصاف افراد کو عزیز رکھتا ہوں اور یہ دنیا کو شیطانوں

کے حوالے کرنے کی بجائے شیطانی قوتوں سے مقابلے کے لئے مدافعانہ اور مصلحانہ جدوجہد کا حامی رہا ہوں کیوں کہ انسانی زندگی جو انسانوں کی اکثریت کے لیے جبر ناگوار کی حیثیت رکھتی ہے اسے کم از کم نرض خوشگوار بنانے کی واحد صورت یہی ہے۔ امریکی اور یورپی اقوام کے پیش نظر یہ بات بڑے اعتماد کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ تہذیب و تمدن کی انتہائی ترقی کے باوجود انسان کبھی اپنی وحشت اور درندگی سے دست بردار نہ ہوگا اور علم و حکمت کے اکتشافات و ایجادات کے باوجود یہ دنیا کبھی مکمل بہشت نہ بن سکے گی۔ پھر بھی انسانوں کی طرف سے اتنی کوشش ضروری ہے کہ انسان مکمل وحشی اور یہ دنیا سر تا سر جہنم نہ بن جائے۔ اس سے زیادہ انسان کی بدنصیبی اور بد توفیقی اور کیا ہو سکتی ہے کہ وہ قدرت (NATURE) سے بہتر ذوقِ حسن رکھنے اور دنیا کو رشک جنت بنانے کے سامان کا مالک و خالق ہونے کے باوجود اپنی فطری کمزوریوں اور خباثتوں کے باعث دنیا کو رشک جنت بنانے سے قاصر رہا ہے اور آئندہ بھی قاصر رہے گا۔ اس بنا پر مجھے انسان بیک وقت قابل نفرت بھی معلوم ہوتا ہے اور قابل رحم بھی۔

اس دور میں جب کہ انفرادیت کی جگہ اجتماعیت نے لے لی ہے۔

اور افراد کی بجائے عوام کی پرستش ہونے لگی ہے۔ عوام کی بجائے افراد کو عزیز رکھنا یقیناً رجعت پسندی پر محمول کیا جائے گا۔ لیکن میں اس رجعت پسندی کو گلے لگانے پر اس لئے آمادہ ہوں کہ عوام کو معصوم سمجھنا، ان کی محبت میں مبتلا ہونا اور ان کی پرستش کرنا میرے بس کی بات نہیں۔ میں اس کا ضرور قائل ہوں کہ عوام کو اس حالت میں رکھنا کہ وہ خون پسینہ ایک کرنے کے باوجود زندگی کی بنیادی ضروریات کو پورا نہ کر سکیں بدترین جرم ہے ——— اور یہ جرم انسان کی انتہائی سنگ دلی اور شقاوت پر دلالت کرتا ہے ——— اگر میرا بس چلے تو میں دنیا کے سارے کاموں کو روک کر سب سے پہلے عوام کو زندگی کے بنیادی مطالبات سے عہدہ برآ ہوئے پر قادر بنانے کی کوشش کروں لیکن مجھے یقین ہے کہ میری یہ کوشش عوام سے ہمدردی کا نتیجہ ہو گی نہ کہ ان سے محبت کا۔ میرے دل میں محبت (خاندانی تعلقاتی اور جنسی محبت سے قطع نظر) کی گنجائش صرف ان افراد کے لیے رہے جو غیر معمولی ذہنی استعداد، جمالیاتی احساسات اور اخلاقی اوصاف کے مالک ہیں۔ ترقی پسند حضرات جو عوام کے عاشقِ زار اور ان کی پرستش کے مدعی ہیں میں انہیں ان کی وسعتِ قلب کی داد دیتا ہوں لیکن ساتھ ہی اس خیال سے ڈرتا بھی ہوں کہ کہیں انسانی تہذیب

وتمدن کے حق میں یہ نئی محبت یا نئی خود فریبی یا نئی ریاکاری مہلک نہ ثابت ہو۔

ممکن ہے میرے بعض قارئین میری جرأت فکر کی تاب نہ لاسکیں لیکن یقین مانئے کہ میں جس جرأت فکر سے کام لیتا ہوں وہ مغربی مصنفین کی جرأت فکر کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں۔ مثال کے طور پر برنرڈ شو کو لے لیجیے اور دیکھئے کہ اس نے سماجی اور سیاسی مسائل سے قطع نظر مذہبی معاملات، مذہبی شخصیات یہاں تک کہ خود حضرت عیسیٰ مسیح کے متعلق کیا کچھ کہہ دیا ہے۔ ہمارے یہاں جرأت خیال اور آزادیٔ فکر کو سکونِ قلب کے ساتھ نہیں دیکھا جاتا۔ اور تو اور اقبال جیسے مفکر کا فتوی ہے کہ ع آزادیٔ افکار ہے ابلیس کی ایجاد۔ لیکن میرا خیال ہے کہ دنیا میں جو فتنے فساد ہوتے رہے ہیں ان میں آزادیٔ افکار کو اتنا دخل نہیں جتنا پابندیٔ افکار کو ہے۔ مصیبت وہیں پیدا ہوتی ہے جہاں آپ اپنی کہیں اور دوسروں کی سننے کو تیار نہ ہوں،

اس مجموعے میں ایک انشائیہ "آزادی اور شرافت" ایسا ہے جو بظاہر مختصر افسانے سے مشابہہ ہے لیکن میں اسے انشائیہ کہنے پر مصر ہوں خصوصاً اس لیے کہ اگرچہ وہ مختصر افسانے سے مشابہہ ہے پھر

بھی اس میں مختصر افسانے کا کوئی بنیادی جزو موجود نہیں نہ تو اس میں پلاٹ ہے نہ کردار نگاری، نہ عمل نہ نقطۂ عروج۔ غرض کچھ بھی نہیں۔
جہاں اس میں مختصر افسانے کے اجزائے ترکیبی مفقود ہیں وہاں اس میں انشائیے کا گفتاری انداز موجود ہے۔ روبرٹ لنڈ نے لکھا ہے کہ " دور حاضر میں انشائیے نے بہت سی شکلیں اختیار کی ہیں۔ کہیں وہ مذہبی خطبہ بن گیا ہے کہیں تقریباً مختصر افسانہ۔ انشائیہ خود نوشت سوانح عمری کا ایک حصہ بھی ہو سکتا ہے اور بکواس بھی، یہ طنزیہ بھی ہو سکتا ہے اور جذباتی بھی" غرض انشائیے کی مختلف شکلیں ہو سکتی ہیں ان میں سے ایک شکل وہ بھی ہے جو "آزادی اور شرافت" میں نظر آتی ہے۔ افسانہ نما انشائیوں کے بڑے دل کش نمونے اے۔ جی۔ گارڈینر کے یہاں ملتے ہیں جو میری برادری یعنی انشائیہ نگاروں کی برادری کا مشہور و ممتاز رکن ہے۔

اس کتاب میں بعض مضامین ایسے بھی ہیں جو انشائیے کے حدود میں نہیں آتے۔ مثلاً "غریب شہر سخن ہائے گفتنی دارد" جو سفرنامہ ہے اور "آپ سے ملیئے" جو طنزیہ خاکوں پر مشتمل ہے۔ یہ مضامین اس مجموعے میں صرف اس لئے شامل کرلئے گئے ہیں کہ اگرچہ یہ تحریریں انشائیہ نہیں پھر بھی ان میں انشائیوں کا سا لطف ضرور ہے اور سرِدست

اس کا امکان نظر نہیں آتا کہ میں کبھی سفر ناموں اور طنزیہ خاکوں کا مجموعہ شایع کر سکوں گا۔

میرے انشائیوں کے بعض قارئین یا سامعین کو مجھ سے یہ شکایت رہی ہے کہ میرے انشائیے کا عنوان دیکھ کر یا سن کر ان کے دل میں جو توقع پیدا ہوئی تھی وہ میرے انشائیے سے پوری نہ ہو سکی۔ اب میں کیوں کر بتاؤں کہ انشائیہ پڑھنے کا اس سے زیادہ غلط طریقہ اور کوئی نہیں ہو سکتا کہ عنوان سے آپ کچھ توقعات وابستہ کرلیں۔ انشائیہ نگار قاری کی توقعات کا ہرگز پابند نہیں ہوتا۔ وہ تو عنوان، انشائیہ اور قاری سبھی کو اپنی مرضی کا پابند رکھتا ہے۔ انشائیوں سے لطف اندوز ہونے کے لیے خود سپردگی یعنی اپنے آپ کو انشائیہ نگار کے حوالے کر دینا پہلی شرط ہے۔

بعضوں کو اس بات کا شکوہ رہا ہے کہ میرے انشائیوں میں "میں" بہت نمایاں ہے۔ نہ جانے اس قسم کی شکایت کرنے والے یہ کیوں بھول جاتے ہیں کہ انشائیہ جیسی شخصی صنفِ ادب "میں" کے مظاہرے ہی کے لیے وجود میں آئی ہے۔ پھر یہ کہ اس "میں" کے پردے میں آپ بھی تو ہو سکتے ہیں۔ اگر آپ کی تصویر کے نیچے کسی اور کا نام لکھ دیا جائے تو کیا وہ تصویر کسی اور کی

ہو جائے گی۔

میرے انشائیوں میں کہیں کہیں ملکی اور غیر ملکی حکومتیں بھی زد میں آئی ہیں گو اس بنا پر اب تک خود مجھے ان کی زد میں آنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ میں اپنی اس خوش نصیبی کو حکومتوں کی کشادہ دلی پر محمول کرتا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ طنز نگاروں اور مزاح نگاروں کے ساتھ اس قسم کی کشادہ دلی برتنا ایک صحت مند علامت ہے۔ جو حکومتیں اپنے کردار کو زیادہ سے زیادہ بے داغ بنانے کی خواہش مند ہیں انہیں ہمیشہ یہ دیکھتے رہنا چاہیئے کہ طنز نگار اور مزاح نگار ان کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں۔ کیا اچھا ہو کہ وہ اپنے معاملات و مسائل میں طنز نگاروں اور مزاح نگاروں سے مشورہ کر لیا کریں۔

اور سب سے پہلے مجھ سے۔

ملکی و غیر ملکی حکومتوں کی طرح کہیں کہیں میرے احباب بھی ان انشائیوں کی زد میں آگئے ہیں۔ لہذا ایک بات کی درخواست ضروری معلوم ہوتی ہے۔ وہ یہ کہ جو احباب میرے انشائیوں کی زد میں نہیں آئے انہیں تو میرا شکر گذار ہونا چاہیے اور جو زد میں آگئے ہیں انہیں مجھ سے کسی قسم کی شکایت نہیں کرنی چاہیئے کیوں کہ کوئی انسانی کمزوری ایسی نہیں جس میں ان لوگوں کی اکثریت مبتلا نہ ہو۔

اس لحاظ سے

ہم ہوئے تم ہوئے کہ نظیرؔ ہوئے
سب انہیں عیبوں کے اسیر ہوئے

اپنی ادبی زندگی میں جن لوگوں سے میرا جھگڑا یا مجھے شکوہ رہا ہے ان میں ایڈیٹر صاحبان سر فہرست ہیں اسی لئے میرے انشائیوں میں ان کا بھی ذکر خیر آگیا ہے۔ اس سلسلے میں میری سب سے بڑی بدنصیبی یہ ہے کہ ایڈیٹر صاحبان کی فہرست میں استاد محترم ڈاکٹر عندلیب شادانی بھی شامل ہیں۔ اور میرا دل ان کی بھی شکایت سے خالی نہیں یہ ضرور ہے کہ جس دن مجھے اُن سے شکایت پیدا ہوئی تھی اُس دن میں نے دوسرے تمام ایڈیٹروں کو بخش دیا تھا اور دل ہی دل میں کہا تھا کہ خدایا شکر ہے کہ تو نے مجھے مضمون نگار بنانے کے ساتھ ساتھ ایڈیٹر نہیں بنایا۔ ورنہ کیا عجب تھا کہ میں مضمون نگار کی حیثیت سے اچھے سے اچھا مضمون لکھنے کے باوجود ایڈیٹر کی حیثیت سے اسے کسی نہ کسی بنا پر رد کر دیتا اور اس طرح جن ناانصافیوں کا مجھے ایڈیٹروں سے شکوہ رہا ہے ان کا گلہ خود اپنے آپ سے بھی ہوتا۔

کسی کی انشائیہ نگاری سے متعلق مضمون ہرگز اس وقت تک

مکمل تصور نہیں کیا جا سکتا جب تک انشائیہ نگار کے اسلوب پر اظہار خیال نہ کیا جائے۔ انشائیہ نگار کے انداز بیان کے متعلق گفتگو نہ کرنے کے معنی اس کے فن کے ایک نہایت اہم پہلو کو نظر انداز کر جانے کے ہیں۔ انشائیہ نگاری میں اسلوب کی اس اہمیت کے باوجود میں اپنے اسلوب کے متعلق کچھ نہیں کہنا چاہتا میرا اپنا کوئی اسلوب ہے یا نہیں۔ اگر ہے تو اس کی تعمیر و توانائی میں کن عناصر اور اثرات کو دخل ہے۔ اس کی امتیازی خوبیاں اور خصوصیات کیا ہیں۔

ان سوالات کا جواب میں اپنے ناقدین اور قارئین پر چھوڑتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ اگر میرے ناقدین اور قارئین نے دیانت اور بصیرت سے کام لیا تو مذکور بالا سوالوں کے باب میں ان کی رائے میری ذاتی رائے سے مختلف نہ ہوگی۔

یہاں تک اپنے انشائیوں کی تعریف میں بہت کچھ کہنے کے باوجود اس بات کا اعتراف ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس مجموعے میں جو انشائیے پیش کیے جا رہے ہیں وہ اس فن میں میری مشق کے نتائج ہیں نہ کہ میری مہارت کے نمونے۔ میں نے اب تک اتنے ہی انشائیے لکھے ہیں جتنے اس مجموعے میں شامل کیے گئے ہیں۔

مجھ پر ایک الزام یہ رہا ہے کہ میں اپنے انشائیوں میں خودنمائی اور خودستائی سے کام لیتا ہوں۔ غالباً اس تمہید کے پڑھنے والے بھی مجھ پر یہ الزام رکھے بغیر نہیں رہ سکتے۔ یہاں میں اپنی صفائی میں اتنا ہی کہوں گا کہ انشائیوں میں خودنمائی اور خودستائی سے کام لینا انشائیہ نگار کا پیدائشی حق ہے اور جہاں تک اس تمہید کا تعلق ہے اس میں خودنمائی اور خودستائی کا جواز یہ ہے کہ میں اپنی خوبیوں اور خامیوں کی نشاندہی کے لیے اپنے دوستوں کے مہربان ہونے اور دشمنوں کے مشتعل ہونے کا منتظر نہیں رہتا میں اپنا دوست اور اپنا دشمن آپ ہوں ــــــ بالفاظ دیگر اپنا مداح اور اپنا محتسب آپ۔

نظیر صدیقی
شعبۂ اردو
قائداعظم کالج۔ ڈھاکا
۱۲ دسمبر سنہ ۱۹۶۰ء

نظیر صدیقی مرحوم

بعض لوگوں کے مرنے کی خبر سننے کے بعد بھی یقین نہیں آتا کہ وہ مر گئے۔ لیکن نظیر صدیقی ان مرنے والوں میں سے ہیں جن کے مرنے کی اطلاع سن کر یہ سوال ذہن میں پیدا ہوتا ہے کہ وہ زندہ ہی کب تھے جو اب مر گئے۔ بہر حال وہ کبھی زندہ رہے ہوں یا نہیں لیکن یہ واقعہ ہے کہ پرسوں رات کے تین بجے وہ جاں بحق ہو گئے۔ آپ قدرتی طور پر یہ جاننے کے لئے بیتاب ہوں گے کہ کس مرض نے مرحوم کو ٹھکانے لگایا اس میں شک نہیں کہ مرحوم بہت سے امراض کا مسکن یا مجموعہ تھے لیکن آپ کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ ان کی موت مرض کی بجائے خود کشی کا نتیجہ تھی۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ انھوں نے اس معاملے میں نہ تو پستول سے کام لیا اور نہ ریل کی پٹری سے کیوں کہ پستول ان کے پاس تھی ہی نہیں اور ریل

کی پٹری پر مرنا انھیں پسند نہ تھا۔ دراصل ان کی پوری زندگی ہی تدریجی خودکشی بن کر رہ گئی تھی۔ لہذا۔ اگر یہ کہا جائے کہ ان کی موت ان کی خودکشی کی تکمیل کا دوسرا نام ہے تو غلط نہ ہوگا۔

مرحوم نے شادی نہیں کی تھی اس لیئے انہوں نے اپنے پیچھے کوئی یتیم نہیں چھوڑا۔ لیکن وہ خود ان یتیموں میں سے تھے جن کے والدین بقید حیات ہوتے ہیں۔

جیسا کہ نام سے ظاہر ہے نظیر صدیقی ایک مسلمان گھرانے میں پیدا ہوئے تھے اور ان کے مسلمان ہونے میں اسی حادثے یا اتفاق کو دخل تھا۔ وہ لڑکپن کے زمانے تک غیر معمولی طور پر خدا پرست رہے اس کے بعد خدا کے وجود پر ان کا ایمان تو باقی رہا لیکن پرستش انہوں نے انسان کی شروع کردی۔ ان کی انسان پرستی ترقی پسندوں کے مانند نہ تھی جن کے نزدیک انسان کے معنی صرف مفلوک الحال طبقے کے لوگ ہیں۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ انسانی حسن کے بڑے پرستار تھے۔ ان کا خیال تھا کہ جس خلوص اور شدت جذبات کے ساتھ انہوں نے انسانی بتوں کی پرستش کی اگر اس خلوص اور شدت جذبات کے ساتھ خدا کی عبادت کرتے تو ان کا شمار ان لوگوں میں ہوتا جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ پہنچے ہوئے بزرگ ہیں۔ مگر انہوں نے خدا کو پانے کی

کوشش نہیں کی اور انسانی بتوں کو کوشش کے باوجود نہ پاسکے۔

یہاں ایک واقعہ کا بیان دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ ایک مرتبہ ان کے ایک ہم پیشہ و ہم مشرب دوست چند روز کے لیۓ ان کی کتاب "زہر عشق" (از شوق لکھنوی) لے گئے۔ جب اس کی واپسی میں غیر معمولی تاخیر ہوئی تو مرحوم نے اپنے عزیز دوست کو لکھا کہ "زہر عشق جلد سے جلد واپس کر دو کیوں کہ عشق تم کرتے ہو اور زہر عشق ہیں۔ اس لیۓ "زہر عشق" میرے ہی پاس رہنی چاہیۓ۔ اگر آپ اس جملہ کی ظرافت سے لطف اندوز ہوتے وقت اس کی صداقت کو نظر انداز نہ کریں تو مرحوم کو سمجھنے میں نسبتاً زیادہ کامیاب ہوں گے۔

نظیر صدیقی مریض پیدا ہوۓ اور مریض مرے۔ وہ جسمانی اور ذہنی دونوں اعتبار سے مریض تھے۔ جسمانی صحت کے لیۓ تمام عمر طبیبوں کی دوا کھاتے رہے اور ذہنی صحت کے لیۓ ترقی پسندوں کا ادب پڑھتے رہے لیکن بقول میر؂ شفا اُن کی تقدیر ہی میں نہ تھی۔

خدا کا شکر ہے کہ مرحوم افسانہ نگاری یا ناول نگاری کی طرف متوجہ نہ ہوۓ۔ ان کی ادبی دلچسپی کا مرکز تنقید نگاری تھا۔ ادب کی اس صنف نے ان کی مریضانہ ذہنیت کا بھرم کھلنے نہ دیا کیوں کہ تنقید میں مریض بھی

محتسب بن جاتا ہے اور بن سکتا ہے لیکن افسانہ نگاری اور ناول
نگاری میں محتسب بھی مریض معلوم ہوتا ہے۔

مرحوم کی ابتدائی تعلیم اتنی گھٹیا ہوئی تھی کہ اس کی تلافی بعد کی اعلیٰ
تعلیم سے بھی نہ ہو سکی۔ چنانچہ یہ واقعہ ہے کہ ایم۔ اے تک تعلیم پانے کے
باوجود وہ اردو اور انگریزی نہ صحیح پڑھ سکتے تھے نہ صحیح بول سکتے تھے
قدرت کی یہ ستم ظریفی عجیب ہے کہ اس نے انھیں زبان و بیان کے معاملے
میں حد درجہ حساس تو بنا دیا تھا لیکن انھیں ایسے ماحول سے محروم رکھا
جو زبان کی صحت اور بیان کی نزاکتوں پر قادر ہونے میں معاون ہوتا ہے۔

مرحوم کو تعلیمی اداروں کی ملازمت بہت پسند تھی۔ خصوصاً پروفیسری انھیں
بہت محبوب تھی۔ وہ ایک کالج میں اردو کے پروفیسر ہو بھی گئے تھے۔ پروفیسر
ہونے کے بعد وہ اکثر سوچا کرتے ــــــ کہ وہ اس معزز پیشے کے اہل ہیں بھی
یا نہیں۔ لیکن جب ان کا دل یہ کہتا کہ وہ اس معزز پیشے کے اہل نہیں تو انھیں
اس خیال سے تسکین ہوتی تھی کہ یہ شعبہ ان سے بھی زیادہ نااہلوں کو برداشت
کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

مرحوم کی آنکھیں گہری نیند سے ہمیشہ ناآشنا رہیں۔ اس معاملے میں وہ
ان لوگوں کی ضد تھے جن کی نیند میں برات کا شور بھی خلل انداز نہیں ہونے
پاتا۔ مرحوم کا یہ حال تھا کہ پتا کھڑکا اور وہ جاگ اٹھے اپنی اس خصوصیت

کی بنا پر انھیں یہ خیال اکثر آتا کہ اگر وہ پروفیسر ہونے کے بجائے پہرہ دار ہوتے تو ملازمت کا حق ادا کرنے میں زیادہ کامیاب رہتے۔

مرحوم کو اپنی جن حماقتوں کا نہایت اذیت ناک احساس تھا اُن میں سے ایک حماقت یہ تھی کہ انہوں نے اپنی تعلیمی زندگی میں تقریر کرنے کی مشق بالکل نہیں کی تھی۔ مقرر بننا ان کی زندگی کے پروگرام میں شامل ہی نہ تھا۔ لیکن پروفیسر بننے کے بعد تقریر و مباحثے سے بچنا اگر محال نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ چنانچہ انھیں با دل ناخواستہ دونوں ہی میں حصّہ لینا پڑتا۔ نتیجہ ظاہر ہے یعنی پروفیسر ہونے کے باوجود اچھی تقریر نہیں کر پاتے تھے۔ تقریر سے پہلے اور تقریر کے بعد کئی دن تک عجیب ذہنی عذاب میں مبتلا رہتے۔ تقریر سے پہلے یہ سوچتے رہتے کہ کہنا کیا ہے اور تقریر کے بعد اپنے آپ کو اس بات پر کوستے رہتے کہ کیا کہنا تھا اور کیا کہہ گئے۔ جب میں ان کی اشک شوئی اور ہمت افزائی کے لیے ان سے کہتا کہ اچھی تقریر بغیر طویل مشق و مزاولت کے نہیں کی جا سکتی تو جواب میں کہتے آپ کا خیال صحیح ہے لیکن جتنی بری تقریریں میں کرتا ہوں اتنی تو مشق و مزاولت کے بغیر بھی نہ ہونی چاہیئے خصوصاً میرے ایسے تعلیم یافتہ شخص کی زبان سے نہ جانے کیوں میرا دماغ جلد یہ فیصلہ نہیں کر پاتا کہ مجھے کس خاص موقع یا موضوع پر کیا کہنا ہے اور کس طرح کہنا ہے۔ اپنی اس کمزوری کی بنا پر میں

خوداعتمادی سے محروم ہوں۔ دراصل میں نہیں جانتا کہ اپنی اس کمزوری کی بنا پر خوداعتمادی سے محروم ہوں یا خوداعتمادی سے محروم ہونے کے باعث اس کمزوری میں مبتلا ہوں۔

مرحوم ان لوگوں میں سے تھے جو اپنی کمزوریوں سے چشم پوشی نہیں کرتے۔ وہ اپنے محتسب آپ تھے۔ انھوں نے اپنی کمزوریوں سے حتی الامکان دوسروں کو نقصان نہیں پہنچنے دیا۔ البتہ انھیں دوستوں اور دشمنوں سے یکساں طور پر چھپائے رکھنے کی کوشش ضرور کی۔ ان کا عقیدہ تھا کہ کسی آدمی کی کمزوریوں کو نہ تو اس کے دوست معاف کرتے ہیں اور نہ اس کے دشمن اس باب میں دوستوں اور دشمنوں میں فرق صرف اتنا ہے کہ دوست پیٹھ پیچھے مزے لے لے کر ان کمزوریوں کا مضحکہ اڑاتے ہیں اور دشمن موقع پاکر یا نکال کر فاتحانہ مسرت کے ساتھ ان کمزوریوں سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔

مجھے مرحوم کے احباب اور شناساؤں میں کوئی شخص ایسا نہ ملا جو ان کی شرافت کا قائل نہ ہو۔ لیکن اس سلسلے میں خود ان کا اپنا خیال عجیب و غریب تھا۔ ایک مرتبہ دوران گفتگو میں مجھ سے کہنے لگے۔ یار! میں بہت شریف آدمی ہوں۔ اور بہت ہی ذلیل بھی۔ دوسروں کو میرے شریف اور مجھے اپنے ذلیل ہونے کے ثبوت اکثر ملتے رہتے ہیں۔ لوگ میرا احترام کرتے

ہیں لیکن میں اپنا احترام آپ کبھی نہ کر سکا۔ دوسرے لوگ مجھے جس قدر بھی عزت کی نگاہ سے دیکھیں لیکن میں اپنی نگاہ میں ذلیل ہی رہا۔ میں نہیں جانتا کہ مجھ میں جو خرابیاں ہیں وہ میری سرشت میں تھیں یا ماحول کے اثر سے میری سرشت بن گئیں۔

اپنے بارے میں مرحوم کا خیال جتنا بھی بُرا ہو لیکن واقعہ یہ ہے کہ مرحوم اپنی تمام کمزوریوں کے باوجود خاصے اچھے آدمی تھے۔ ہر ایک سے اچھا سلوک کرتے تھے۔ خدا ان کے ساتھ کیسا سلوک کرے گا یہ کہنا مشکل ہی نہیں محال بھی ہے۔ ویسے ان کے ایک دوست کا قیاس یہ ہے کہ ان کے ساتھ خدا کا جو سلوک بھی ہوگا افسوسناک ہی ہوگا ——— یعنی اگر جہنم کی نذر کیے گئے تو یہ تو افسناک ہوگا ہی لیکن اگر جنت میں بھیج دیے گئے تو یہ اور زیادہ افسوسناک ہوگا کیوں کہ انھوں نے دنیا میں جن لوگوں کو جنت میں جانے کی تیاری کرتے دیکھا تھا ان میں سے بیشتر ایسے تھے کہ ان کے ساتھ اگر انھیں دو منٹ بھی بیٹھنے کی سعادت نصیب ہوتی تو ان کا دم گھٹنے لگتا۔

مرحوم بظاہر بالکل نارمل آدمی معلوم ہوتے تھے لیکن انھیں اپنے آپ پر ہمیشہ ابنورمل ہونے کا شبہ رہا جس کا ایک خاص سبب ان کی ذہنی کیفیت بھی تھی۔ ایک مرتبہ مجھ سے کہنے لگے میں کچھ عجیب آدمی ہوں۔

میری طبیعت یا تو مشتعل (EXCITED) رہا کرتی ہے یا مضمحل (DEPRESSED) ہیں ذہن میں یا تو اقبال و جوش کی سی نظمیں کہتا رہتا ہوں یا میر و فانی کے سے اشعار۔ مجھے یا تو بڑے بڑے کارناموں کا بھی سرانجام آسان معلوم ہوتا ہے یا پھر چھوٹے سے چھوٹا کام بھی دشوار نظر آتا ہے۔ مختصر یہ کہ میرا خون یا تو بالکل گرم رہتا ہے یا بالکل سرد۔

مرحوم تنگ دلی سے جس قدر دور تھے تنگ دستی ان سے اتنی ہی قریب تھی مگر یہ بات ایسے لوگوں کی سمجھ میں کیسے آسکتی ہے جو والدین کی موجودگی اور بیوی بچوں کی عدم موجودگی کو اقتصادی آسودگی کی ضمانت سمجھتے ہیں۔ بہرحال یہ واقعہ ہے کہ انھیں اچھا کھانے اور اچھا پہننے کی توفیق بہت کم نصیب ہوئی۔ ایک مرتبہ بڑی مشکلوں سے وہ ایک سوٹ بنانے میں کامیاب ہوئے لیکن ایک سال تک ٹائی نہ خرید سکے۔ آخرکار مجبور ہو کر انھوں نے اپنے ایک عزیز اور بے تکلف دوست سے فرمائش کی کہ اب کی ہندوستان جاؤ تو وہاں سے میرے لیے ایک اچھی مگر سستی ٹائی لیتے آنا۔ ان کے دوست ہندوستان گئے تو اپنے لیے دو سوٹ لیتے آئے اور مرحوم کے لیے ٹائی لانا بھول گئے جب مرحوم نے ٹائی مانگی تو کہنے لگے، میاں ٹائی خرید کر نہیں لگائی جاتی

دوستوں سے چھین لی جاتی ہے چونکہ تم چھیننے کے فن سے واقف نہیں اس لیے میں اپنی ایک ٹائی تمہیں بخش دوں گا۔ اس پر مرحوم نے کہا ہاں بھئی میری زندگی کا مدار اب دو ہی چیزوں پر رہ گیا ہے۔ دینوی زندگی کا مدار بخشش پر اور اخروی زندگی کا مدار بخشائش پر۔ تم مجھے ٹائی بخش دو۔ خدا میرے گناہ بخش دے گا۔

مرحوم کی ایک بدنصیبی یہ تھی کہ وہ جس گھریلو تنہائی کے آرزومند تھے وہ انھیں کبھی میسر نہ آئی اور جس روحانی یا جذباتی تنہائی نے ان کی زندگی کو ویران کر رکھا تھا اس سے انھیں کبھی نجات نہ مل سکی۔ ان کا قول تھا کہ اپنے گھر میں اکیلے رہنا حیات بخش مسرت کی حیثیت رکھتا ہے اور دنیا میں اکیلے رہنا جانگسل محرومی ہے لیکن ان کے ساتھ ہوا یہی کہ ان کا گھر ان کے خاندان کے افراد سے بھرا ہوا تھا اور وہ دنیا میں اکیلے تھے۔

مرحوم طبعاً بڑے نرم دل واقع ہوئے تھے لیکن انھیں ہر غلط اور غیر منصفانہ بات پر شدید غصہ آتا تھا۔ اگر ظلم اور زیادتی کرنے والا ان کے قابو سے باہر ہوتا تو صرف یہ کہہ کر رہ جاتے کہ جی چاہتا ہے حرامزادے کو اتنا ماروں کہ خود مجھے رحم آنے لگے۔

قدرت کی طرف سے مرحوم کو جہاں دکھا ہوا دل نصیب ہوا تھا وہاں

شگفتہ طبیعت بھی ملی تھی۔ دوستوں کی محفلوں میں وہ ہمیشہ ہنستے ہنساتے پائے گئے۔ ان میں مذاق کرنے اور مذاق سے لطف اندوز ہونے کی صلاحیت خاصی تھی۔ البتہ بد مذاقی کو مذاق سمجھنے کی صلاحیت بالکل نہ تھی۔ اس وقت مجھے ان کا ایک لطیفہ یاد آگیا۔ ایک مرتبہ وہ ایک ایسے دوست کے یہاں گئے جو اپنے نوکروں سے لے کر دوستوں تک کو "ارے خانہ خراب" کے الفاظ سے خطاب کرتے تھے باتوں باتوں میں انہوں نے مرحوم کو بھی خانہ خراب کہہ دیا۔ اس پر مرحوم نے کہا۔ دیکھئے حضرت! یہ الفاظ اگر آپ میرے گھر پر استعمال کرتے تو مجھے اعتراض نہ ہوتا۔ لیکن یہاں ان کا استعمال اس لئے غلط ہے کہ خانہ آپ کا ہے اور خرابی میری ہو رہی ہے۔

یوں تو مرحوم عام اور نجی صحبتوں میں ہمیشہ ہنستے بولتے نظر آتے تھے۔ مگر جہاں تک میں اندازہ کر سکا ہوں جلوت کے نظیر صدیقی خلوت کے نظیر صدیقی سے قطعاً مختلف تھے۔ تنہائی میں میں نے انھیں اور انہوں نے اپنے آپ کو اکثر افسردہ اور آزردہ پایا۔ نہ صرف دنیا سے آزردہ بلکہ اپنے آپ سے بھی۔ مجھ پر یہ راز آخر تک نہ کھلا کہ وہ اپنے آپ سے خفا ہونے کے باعث دنیا سے خفا تھے یا دنیا سے خفا ہونے کے باعث اپنے آپ سے بھی خفا تھے۔

مرحوم کی زندگی انتقادی۔ ذہنی اور جذباتی بحران کا ایک ایسا ——
سلسلہ تھی جو ان کے مرنے سے پہلے کبھی نہیں ٹوٹا۔ اپنے بحران و ہیجان
پر قابو پانے میں انھیں اپنے پسندیدہ گانوں اور موسیقی سے بڑی مدد
ملتی تھی۔ لیکن اس باب میں ان کی محرومی یہ تھی کہ انھیں نہ تو گراموفون
رکھنے کی استطاعت تھی نہ ریڈیو رکھنے کی۔ تاہم جب کبھی اور جہاں کہیں
اچھا پسند کا کوئی گانا سن لیتے تو اپنے سارے دکھ درد کو بھول جاتے یا اُن
پر غالب آنے کی قوت اپنے اندر محسوس کرنے لگتے۔ اچھا گانا سن کر ان کی
خود اعتمادی واپس آجاتی اور انسانیت سے اُن کا اُنس بیدار ہو جاتا
ان کا خیال تھا کہ اگر دنیا کی ساری قومیں شمشیر وسناں اول طاؤس و رباب
آخر کی بجائے، طاؤس و رباب اول، طاؤس و رباب آخر، کے اصول پر
عمل کرنے لگیں تو دنیا میں وہ امن و آشتی قائم ہو جائے جس کا خواب ہمیشہ
دیکھا گیا ہے لیکن جس کی تعبیر یو۔ این۔ او (U.N.O) کے باوجود
نظر نہیں آتی۔

زندگی کے ہاتھوں اچھی طرح پٹنے کے بعد مرحوم نے رواقی فلسفے
(STOICISM) پر عمل کرنے کی کوشش کی تھی۔ انھیں اپنے آپ
پر یہ گمان بھی ہو چلا تھا کہ انہوں نے اپنے جی کو مار لیا ہے اور دنیا کے
نشاط و الم اور سود و زیاں سے بلند ہو چکے ہیں شاید اسی ذہنی رویے کا

ردعمل تھا کہ جب کوئی دل آویز صورت ان کے سامنے سے گذرتی تو وہ غالبؔ کا یہ شعر ضرور پڑھتے ؎

توڑ بیٹھے جب کہ ہم جام و سبو پھر ہم کو کیا
آسماں سے بادۂ گلفام اگر برسا کرے

چونکہ مجھے ان کے رازدار ہونے کا شرف حاصل ہے اس لئے ایک مرتبہ میں نے ان سے سنجیدگی سے پوچھا کیا واقعی آپ نے اپنے جی کو مار لیا ہے۔ کہنے لگے کوشش تو ضرور کرتا رہا ہوں لیکن جی کو مار لینا اتنا آسان نہیں جتنا میں نے سمجھ لیا تھا۔ جام و سبو کو توڑ بیٹھنا اس بات کی ضمانت نہیں کہ بادۂ گلفام کی آرزو جاتی رہی۔

مرحوم بڑے صلح کل قسم کے آدمی تھے لیکن ان کی ساری زندگی اپنے حالات و جذبات سے لڑتے گزری۔ جذبات کے معاملے میں وہ صرف جسمانی تسکین کے قائل نہ تھے بلکہ روحانی تسکین پر بھی ایمان رکھتے تھے۔ ان کا قول تھا کہ ایک محبت آمیز بوسہ ایک غیر محبت آمیز وصال سے زیادہ قیمتی ہوتا ہے۔

مرحوم خاصے ذہین آدمی تھے لیکن ان کی ذہانت آڑے وقت کام نہ آتی تھی۔ وہ ایک ایسے مقرر تھے جس کو اپنی تقریر کی اہم باتیں تقریر کے بعد سجھائی دیتی تھیں۔ وہ ایک ایسے معلم تھے جو کلاس سے

نکلنے کے بعد اپنے شاگردوں کو بہتر نکتے بتا سکتا تھا۔ وہ ایک ایسے امیدوار بھتے جو انٹرویو ختم ہونے کے بعد ہر سوال کا صحیح جواب دے سکتا تھا۔ غرض کہ انھیں پٹنے کے بعد بچنے کی تدبیریں خوب سوجھتی تھیں۔

مرحوم زندگی بھر صحیح زبان بولنے کی کوشش کرتے رہے لیکن کامیاب کبھی نہ ہوئے۔ نہ جانے کیوں صحیح اور مناسب الفاظ وقت پر ان کا ساتھ نہیں دیتے تھے اور جب غلط الفاظ ان کی زبان سے نکل جاتے تو فوراً صحیح الفاظ رئیسانہ انداز سے ان کے ذہن میں تشریف لے آتے۔ مرحوم نے بچپن یا لڑکپن میں آنکھ مچولی کا کھیل کھیلا ہو یا نہیں لیکن الفاظ زندگی بھر ان کے ساتھ آنکھ مچولی کھیلتے رہے۔

مرحوم اپنے حافظے کی کمزوری سے سخت عاجز رہا کرتے تھے ان کی یہ کمزوری بارہا ان کی سبکی کا باعث ہوئی۔ بیچارے اچھے سے اچھا شعر بھی یاد نہیں رکھ سکتے تھے۔ اس کمزوری سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے ایک مرتبہ وہ ایک ڈاکٹر کے پاس گئے اور کہا کہ کوئی دوا ایسی دیجیے جس سے حافظے کی کمزوری دور ہو جائے۔ ڈاکٹر نے انھیں ایک ایسی دوا دی جو کھانا کھانے کے ٹھیک پندرہ منٹ

بعد کھانا پڑتی تھی۔ لیکن جب ایک مہینے تک دوا کے استعمال کے
باوجود دوا کھانے کا وقت بھولتے رہے تو انھوں نے ڈاکٹر سے جاکر
کہا کہ "جس دوا سے دوا کھانا بھی یاد نہ رہے اس سے اور کیا یاد رہ سکتا
ہے" جہاں تک مجھے علم ہے اس دوا کے بعد انھوں نے حافظے کی کمزوری
کے لیے پھر کوئی دوا استعمال نہیں کی۔ ایک مرتبہ میں نے ان سے کہا
آخر آپ اپنے حافظے کی کمزوری کے لیے کوئی دوسری دوا کیوں نہیں
استعمال کرتے۔ کہنے لگے کہ "ممکن ہے کسی دوا سے حافظے کی کمزوری
دور ہو جائے لیکن جب سرے سے حافظہ ہی نہ ہو تو دوا سے
کیا ہوگا ؟"

نظیر صدیقی فرائض اور ذمہ داریوں سے بہت کتراتے تھے لیکن
جو فرائض اور ذمہ داریاں ان کے سارے پینترے اور پہلو تہی کے باوجود
ان کو گھیر لیتی تھیں ان کی انجام دہی میں وہ کوتاہی نہیں کرتے تھے وعدے
وعید کے معاملے میں عموماً سچے پائے گئے ویسے کبھی کبھی جھوٹ بھی
بول لیتے تھے۔ غالباً اس لیے کہ سچے آدمی اچھے نہیں مانے جاتے
اور اچھے آدمی ہمیشہ سچ نہیں بولا کرتے ساتھ ہی ان کا یہ عقیدہ بھی
تھا کہ انسانی سوسائٹی منافقتوں کو برداشت کرسکتی ہے اور کرلیتی
ہے لیکن راست بازوں اور صاف گویوں کو ہرگز برداشت

نہیں کرتی۔

مرحوم کی ایک خصوصیت عجیب و غریب تھی۔ وہ یہ کہ ان کا حافظہ جس قدر کمزور تھا اسی قدر انھیں شعر و ادب کے بہترین ٹکڑوں کو یاد رکھنے کی خواہش رہا کرتی تھی۔ ان کی آواز جتنی خراب تھی اتنی ہی خوش آوازی کے ساتھ وہ گفتگو کرنے کے آرزو مند رہا کرتے تھے۔ زبان جس قدر غلط بولتے تھے اسی قدر صحیح بولنے کی آرزو میں گھلے جاتے تھے۔ نغمہ و موسیقی سے جتنے محروم تھے اتنا ہی وہ ان چیزوں کو ترستے رہتے تھے۔ جس قدر پرسکون و پرسکوت ماحول میں رہنا چاہتے تھے اتنے ہی شور و شغب کے ماحول میں انھیں رہنا پڑتا تھا۔ ان تمام باتوں نے ان میں ناتمامی، نارسائی اور ناآسودگی کا ایک ایسا احساس پیدا کر دیا تھا جو ہر وقت انھیں ستاتا رہتا تھا۔ اس اذیت ناک احساس نے ان سے زندہ رہنے کا حوصلہ چھین لیا تھا۔ وہ ہر وقت اپنے آپ سے الجھتے رہتے، اپنا احتساب کرتے رہتے اور اپنے آپ کو سزا دیتے رہتے۔ ظاہر ہے کہ ایسا شخص ہمیشہ ذہنی کرب میں مبتلا رہتا ہوگا اور اس کے بارے میں یہ امید نہیں کی جا سکتی کہ وہ کبھی سچی خوشی سے آشنا ہوا ہوگا۔

نظیر صدیقی میں خود اعتمادی کی بڑی کمی تھی۔ انھیں اپنے آپ

پر اتنا بھی اعتماد نہ تھا جتنا ان کے جاننے والے ان پر اعتماد رکھتے تھے۔ انھیں اپنی زندگی میں کئی ایسے آدمی ملے جنھوں نے تعلقات کی مختصر مدت کے باوجود انھیں اپنا راز دار بنا لیا۔ لیکن جہاں تک مجھے معلوم ہے وہ دوسروں کو دیرینہ تعلقات اور گہرے ارتباط کے باوجود اپنا راز دار بنانے سے احتراز کرتے تھے۔ شاید اس کی وجہ ان کا یہ عقیدہ ہو کہ راز راز دار کے سوا ہر ایک کے سینے میں محفوظ رہتا ہے۔"

مرحوم کے بعض خیالات عجیب وغریب تھے۔ مثلاً وہ سنگ دل آدمیوں کو سب سے زیادہ خوش نصیب سمجھتے تھے کیوں کہ ان کا خیال تھا کہ جس دنیا کے لوگ چلتے پھرتے جیتے جاگتے انسانوں سے زیادہ افسانوی اور فلمی کرداروں پر ترس کھانے کے عادی ہوں اس دنیا میں سنگ دل ہونا اپنے حق میں بڑی نعمت ہے۔ ان کا خیال تھا کہ حساس آدمیوں کو دنیا اتنی تکلیف نہیں پہنچاتی جتنی وہ خود اپنے آپ کو پہنچاتے ہیں۔

جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں مرحوم انسانی حسن کے بڑے دلدادہ تھے۔ مگر ان کی نظر حسن کے محبوب × بے ہونے سے زیادہ مظلوم ہونے پر رہا کرتی تھی۔ انھیں اس خیال سے بڑا دکھ ہوتا تھا کہ ہر زمانے میں حسن

کے ساتھ جس قدر عیش و عیاشی کا تصور وابستہ رہا اتنا لطافت و نفاست کا نہیں۔ اس باب میں مجھے ان کا یہ قول نہیں بھولتا کہ کس قدر افسوس کی بات ہے کہ اچھی صورت پر بری نظر حسن کا انعام بھی ہے اور انجام بھی۔" مرحوم کسی حسین لڑکی یا لڑکے کو دیکھتے تو زیر لب اتنا ضرور کہتے۔ "بہت حسین واقع ہوئے ہو۔ دنیا تمہیں اس جرم کی سزا دیئے بغیر نہ چھوڑے گی۔"

مرحوم اسکول کی طالب علمی کے زمانے تک بڑے مذہبی تھے پانچ وقت کی نماز پڑھتے روزے رکھتے تلاوت کرتے اور کبھی کبھی تہجد کی نماز بھی پڑھ لیتے تھے۔ لیکن عمر کے ساتھ ساتھ مذہب سے ان کی بیگانگی بڑھتی گئی۔ ایک مرتبہ انہوں نے ایک نوجوان کو نماز پڑھتے اور روزہ رکھتے دیکھا تو کہنے لگے۔ میاں نمازی یا روزہ دار بننے سے بہتر اچھا آدمی بننا ہے۔ اچھا آدمی بننے کی کوشش کرو۔ لیکن ان کی یہ نصیحت اس نوجوان کی سمجھ ہی میں نہیں آئی کیوں کہ عام لوگوں کی طرح وہ بھی نمازی یا روزہ دار کو اچھے آدمی کا مترادف سمجھتا تھا بہرحال مرحوم کو اس خبر سے کبھی خوشی نہ ہوئی کہ شہر میں نمازیوں کی تعداد بڑھ رہی ہے۔ وہ ہمیشہ اس خبر کے منتظر رہے کہ شہر میں چوروں اور رشوت خوروں کی تعداد گھٹ رہی ہے۔

مرحوم کو سیاسی واقعات اور حالات سے اتنی ہی دلچسپی تھی جتنی عام آدمیوں کو ہوتی ہے۔ اسی لیے میں سیاسی اشخاص اور سیاسی اداروں کے متعلق ان کی رائے جاننے کا خواہشمند کبھی نہیں رہا۔ خود مرحوم بھی اس باب میں غلط رائے ظاہر کرنے پر خاموش رہنے کو ترجیح دیتے تھے۔ لیکن ایک دفعہ ان کی موجودگی میں دو دوستوں کے درمیان یو۔ این۔ او کی دیانتداری کے متعلق گفتگو چھڑ گئی تو مرحوم یہ کہے بغیر نہ سکے کہ یارو! ایک ایسے دارے کی دیانتداری کا قائل ہونا یا کسی کو قائل کرنا کیا معنی جہاں غیر جانبداری بھی غیر جانبدار نہیں ہوا کرتی۔

نظیر صدیقی کی ذات چھوٹوں خصوصاً بچوں کے لئے یکسر محبت اور سراپا شفقت تھی۔ بچوں کو راہ راست پر لانے کے لیے مارنے پیٹنے کے قائل نہ تھے۔ اگر کسی بچے کو پٹتے دیکھتے تو اُسے بچانے کی کوشش کرتے۔ ایک مرتبہ مرحوم اپنے ایک دوست سے ملنے گئے تو دیکھا کہ وہ اپنے لڑکے کی کسی غیر سعادت مندانہ حرکت پر بے حد خفا ہو رہے ہیں۔ مرحوم کو دیکھتے ہی کہنے لگے۔ نظیر صاحب! میرا خیال ہے غیر سعادت مند اولاد قوم کی سب سے بڑی بدنصیبی ہے۔ اس پر مرحوم نے کہا۔ آپ کا خیال صحیح نہیں۔" تو پھر اس سے بڑی بدنصیبی کیا ہے؟"

دوست نے بڑی بے صبری سے پوچھا۔ مرحوم نے مفکرانہ انداز میں جواب دیا۔ قوم کی سب سے بڑی بدنصیبی غیر ذمہ دار والدین ہیں نہ کہ غیر سعادت مند اولاد۔

مرحوم کو انسانیت کے مستقبل سے مایوس بنانے میں روس اور امریکہ کی سیاست کو اتنا دخل نہ تھا جتنا روزمرہ زندگی میں عام لوگوں کی فرض ناشناسی اور بد دیانتی کو۔ کہا کرتے تھے کہ جب آدمی معمولی معمولی باتوں میں ایمان اور توازن کھو دیتا ہے تو پھر بڑے معرکوں اور مقصد ۔ ں میں اس سے کیا امید کی جائے۔ جس دنیا میں محبت، شرافت، ہمدردی، صلح و آشتی اور عجز و انکسار کے پرچار کرنے والے خود ہی ان صفات سے محروم ہوں اس دنیا کا حال ہولناک اور مستقبل معرض خطر میں کیوں نہ ہو۔

مرحوم اپنے ملک کے مستقبل سے صرف اس لیئے مایوس ہو گئے تھے کہ یہاں کے لوگوں کو سڑک پر چلنے تک کا ڈھنگ نہیں آتا۔ اکثر کہا کرتے کہ جس ملک میں لوگ کاندھے پر چھاتا رکھ کر یا بغل میں چھتری دبا کر آگے پیچھے دائیں بائیں دیکھے بغیر سڑک سڑک پر چلنے کے عادی ہوں وہ ملک سقراط و بقراط پیدا کرلے تو کرلے لیکن تہذیب و ترقی کے اعلیٰ منازل ہرگز طے نہیں کرسکتا۔

مرحوم کو انسان کی جس خصوصیت پر ہنسی بھی آتی تھی اور غصہ بھی وہ یہ ہے کہ انسان دوسروں کے احساس فرض اور خلوص جذبات کا ہمیشہ امتحان لیا رہتا ہے لیکن یہ کبھی نہیں دیکھتا کہ وہ خود اس امتحان میں کس حد تک کامیاب یا ناکامیاب رہا۔ وہ آدمی کی اس خصوصیت سے بھی لطف اندوز ہوتے تھے کہ ایک بر خود غلط آدمی دوسرے بر خود غلط آدمی کو برداشت نہیں کر سکتا اور جو شخص خود ہی خود نمائی اور خود ستائی کی کمزوریوں میں مبتلا ہے وہ دوسروں کی خود نمائی اور خود ستائی کا مضحکہ اڑائے بغیر نہیں رہ سکتا۔

مرحوم کی ادبی زندگی کا آغاز شاعری سے ہوا تھا۔ ان کی ابتدائی شاعری ان کے شوق کا نتیجہ تھی۔ اس وقت انھیں نہ تو شعر سمجھنا آتا تھا اور نہ شعر کہنا۔ جب شعر کہنے کی دقتیں ان کی سمجھ میں آگئیں تو انہوں نے شاعری ترک کر کے نثر نگاری شروع کر دی لیکن جب بی اے میں پہنچے تو ان کے دل میں پھر شعر کہنے کی تحریک پیدا ہوئی۔ اس تحریک میں شوق کی بجائے ان کی شخصیت کو دخل تھا۔ اس زمانے سے لے کر مرتے دم تک ان کی شاعری کا سلسلہ جاری رہا۔ مرحوم کے اشعار سے تقریباً سبھی سننے والے متاثر ہوتے تھے۔ لیکن جب بعض خاص احباب انھیں ان کے اشعار کی داد دیتے تو وہ ٹھنڈی سانس لے کر

کہا کرتے۔ اچھے اشعار سے سبھی لوگ متاثر ہوتے ہیں سوائے اس شخص کے جس کے سلوک نے وہ اشعار کہلوائے ہیں۔ ایک مرتبہ میری موجودگی میں ان کے ایک نکتہ سنج دوست نے ان کے بعض اشعار کی نشتریت کی تعریف کی۔ اس پر مرحوم نے کہا۔ آپ کی تعریف سے مجھے خوشی تو ضرور ہو رہی ہے۔ لیکن جی یہی چاہتا ہے کہ کاش ایسے اشعار کہنے کی ضرورت پیش نہ آتی۔

کہا جاتا ہے کہ زندگی کا سب سے بڑا المیہ موت ہے۔ لیکن مرحوم کی زندگی کا سب سے بڑا المیہ خود ان کی زندگی تھی مختصر یہ ہے کہ وہ زندگی بھر زندگی کا رونا روتے رہے۔ ان کی شاعری اسی رونے سے عبارت ہے۔ انہوں نے شعر کے پردے میں بعض ایسی باتیں بھی کہی ہیں جنھیں ان کی زندگی کے ناگفتنی راز سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ ان کا قول تھا کہ شاعر جو باتیں روزمرہ زندگی میں کسی کو نہیں بتا سکتا انھیں اپنی شاعری میں بتا دیتا ہے۔ اور جو باتیں شاعری میں بھی بتانے کے لائق نہیں ہوتیں انھیں وہ اپنی ڈائری میں چھوڑ جاتا ہے۔ لیکن زندگی میں بہت سی باتیں ایسی بھی ہوتی ہیں جنھیں نہ تو شاعری میں لایا جا سکتا ہے اور نہ ڈائری میں چھوڑا جا سکتا ہے۔ اس بنا پر یہ قیاس کرنا غلط نہ ہوگا کہ مرحوم کی زندگی کے بہت سے راز ان کے ساتھ دفن ہو گئے اور اب ان کا معلوم ہونا محالات سے ہے لیکن اگر مجھے ان کی ڈائری ہاتھ آگئی تو ممکن ہے میں ان کی شخصیت پر

کچھ اور روشنی ڈال سکوں۔ سردست میں دعائے مغفرت پر اکتفا کرتا ہوں
حالانکہ مرحوم دعا کے قائل نہ تھے اور جب کوئی شخص انھیں کسی بات
کی دعا دیتا تو وہ کہا کرتے ع

دعا سب کرتے آئے ہیں دعا سے کچھ ہوا بھی ہو۔

۱۹۵۵ء

جہاں میں رہتا ہوں

یہ نہ پوچھیے کہ میں کہاں رہتا ہوں۔ صرف اتنا جان لیجئے کہ جہاں میں رہتا ہوں وہاں کیا کچھ پاتا ہوں۔ اس سلسلے میں غالباً سب سے اہم بات یہ ہے کہ جہاں میں رہتا ہوں وہاں کے باشندوں کی اکثریت نے زندگی بسر کرنے کی بجائے زندہ رہنے پر قناعت کرلی ہے۔ اس کی بنیادی وجہ ان کی اقتصادی زبوں حالی ہے۔ چنانچہ ہمارے یہاں ایسے لوگوں کا کوئی شمار نہیں جو یا تو پیٹ کاٹ کر جیتے ہیں یا جیب کاٹ کر۔ ہمارے یہاں جیب کاٹنا صرف ادباشوں کا مشغلہ نہیں بلکہ وزراء کابینہ تک

اس فن سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ اگر آپ ہمارے یہاں کے کسی وزیر کی تعریف میں سب سے بڑی بات کہنا چاہیں تو اس کے سوا اور کچھ نہیں کہہ سکتے کہ آپ بڑے دیانت دار وزیر ہیں۔ یہی بات اگر آپ کسی مغربی ملک کے وزیر کے بارے میں کہیں تو وہ اُسے اپنی تعریف سے زیادہ توہین پر محمول کرے گا اور کیا عجب کہ اس قسم کا تعریفی جملہ سُن کر وہ آپ پر ہتک عزتی کا مقدمہ دائر کر دے۔ اس لیے نہیں کہ مغربی ممالک میں دیانت داری باعث توہین ہے بلکہ اس لیے کہ کسی کی تعریف میں اس قسم کے جملے کا استعمال ایسا ہی ہے۔ جیسے آپ کسی کا تعارف کراتے ہوئے کہیں کہ آپ ہیں مسٹر ... بڑے شریف آدمی ہیں۔ چوری نہیں کرتے۔

جہاں میں رہتا ہوں وہاں بے روزگاروں کی تعداد تو کثیر ہے ہی جو لوگ سرکاری محکموں میں ملازم ہیں وہ بھی فراغت کی زندگی بسر نہیں کر پاتے۔ عام لوگوں کو جسم و جان کا رشتہ قائم رکھنے میں بڑی مشکلوں کا سامنا رہا کرتا ہے۔ ان کے یہاں پہلی تاریخ تو پہلی ہی کو آتی ہے لیکن ۳۰ یا ۳۱ تاریخ اپنے وقت سے پہلے ہی آنا شروع کر دیتی ہے۔ بیشتر ملازمتوں میں تنخواہ اس حد تک کم ہے کہ آدمی مجرمانہ زندگی بسر کرنے پر مجبور ہے۔ ویسے جرائم کے انسداد کے لئے حکومت نے بہت

سے انتظامات کر رکھے ہیں۔ ان میں سے ایک انتظام کا نام ہے اینٹی کرپشن ڈیپارٹمنٹ۔ اس ڈیپارٹمنٹ کے عہدے داروں کا دستور یہ ہے کہ وہ چھوٹے مجرموں کو سزا دیتے ہیں۔ اور بڑے مجرموں کو معاف کر دیتے ہیں۔ ممکن ہے جرائم کی روک تھام کے اس طریقے میں کوئی نفسیاتی نکتہ پوشیدہ ہو۔ لیکن عام لوگوں کا خیال یہی ہے کہ اینٹی کرپشن والے اینٹی کم اور کرپشن زیادہ ہوتے ہیں۔

جہاں میں رہتا ہوں وہاں شرفا پولس اور عدالت دونوں سے خائف رہتے ہیں حالانکہ پولیس اور عدالت سے خائف رہنا جرائم پیشہ لوگوں کا حق ہے۔ لیکن یہاں جرائم کی سرپرستی یا تو پولیس کرتی ہے یا عدالت۔ یہاں کی پولیس اور عدالت میں فرق صرف اتنا ہے کہ پولیس والے جرائم پیشہ لوگوں سے دوستانہ، مخلصانہ اور برادرانہ تعلقات رکھتے ہیں۔ اور عدالت کے عملے خود ہی جرائم پیشہ ہوتے ہیں۔ یہاں کی عدالتوں میں کوئی کام رشوت دیئے بغیر ہو ہی نہیں سکتا۔ یہاں تک کہ اگر آپ کلکٹر صاحب سے انتظار کے دن انتظار کی راتیں گذارے بغیر ملنا چاہیں تو ان کے چپراسی کو خوش کئے بغیر ان کا دیدار نصیب نہیں ہو سکتا۔ کلکٹر صاحب کو اپنے چپراسی کی اس عادت کا علم ضرور ہوتا ہے مگر چونکہ وہ اس عادت کو صرف عادت سمجھتے ہیں بری عادت نہیں

اس لیۓ اس کے خلاف کاروائی کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔

جہاں میں رہتا ہوں وہاں تعلیم یافتہ ہونے کے معنی ذمہ دار شہری یا شائشتہ و مہذب آدمی ہونے کے نہیں۔ ذمہ دار شہری یا شائستہ و مہذب آدمی بننے کا فرض ہم نے دوسرے ممالک کے باشندوں کے لیۓ چھوڑ رکھا ہے۔ ہمارے یہاں تعلیم یافتہ ہونے کے معنی غیر تعلیم یافتہ نہ ہونے کے ہیں اور بس۔

جہاں میں رہتا ہوں وہاں کے باشندے بہ حیثیت قوم ترقی کر رہے ہیں یا نہیں، اس بارے ایک سے زیادہ رائیں ہو سکتی ہیں۔ لیکن جہاں تک افراد کا تعلق ہے ان کی ترقی میں ذرہ برابر کلام نہیں۔ چنانچہ یہاں اس قسم کی مثالیں نایاب نہیں، کہ جو شخص آج سے آٹھ دس سال پہلے بیڑی بناتا تھا وہ اب قوم کی تقدیر بنانے کے لیۓ اخبار کا ایڈیٹر بن گیا ہے، جو شخص پہلے کلرک تھا وہ اب کالج میں پروفیسر ہو گیا ہے۔ جو شخص پہلے ہیڈ کلرک تھا وہ اب پرنسپل کے عہدے پر فائز ہے۔ جس شخص کو قدرت نے سیاسی جلسوں اور جلوسوں میں نعرہ لگانے کے لیۓ پیدا کیا تھا وہ۔ اسے قوم کی بدنصیبی نے قوم کو ٹھکانے لگانے کے لئۓ عزت مآب وزیر بنا دیا ہے جو شخص کل تک فرقہ وارانہ ذہنیت کا ہیرو تھا وہ آج وسیع تر انسانیت کا حامی ہے، جو شخص کل تک الحاد کا خوگر تھا وہ آج اسلام

کا خیر خواہ ہے اور اسلام بھی وہ جو خاص ہمارے ملک کے کارخانے میں تیار ہو رہا ہے۔

جہاں میں رہتا ہوں وہاں کی آبادی مختلف مذاہب کے ماننے والوں پر مشتمل ہے۔ ہر مذہب کے پیرو اپنے مذہب کو بہت ہی عزیز رکھتے ہیں۔ مذہب سے ان کی محبت کا یہ عالم ہے کہ مذہب کے نام پر ہمیشہ مرنے مارنے کو تیار رہا کرتے ہیں۔ لیکن ہر فرقے کے مذہب میں جو اخلاقی تعلیمات پائی جاتی ہیں ان پر عمل کوئی نہیں کرتا۔ غرض کہ لوگ خدا کی عبادت تو ضرور کرتے ہیں لیکن اس کی اطاعت بالکل نہیں کرتے

جہاں میں رہتا ہوں وہاں مذہب کا سب سے زیادہ درد غنڈوں کے جگر میں پایا جاتا ہے۔ مذہب اور غنڈہ گردی کا اجتماع سمجھ میں آئے یا نہ آئے لیکن یہاں دیکھنے میں ضرور آتا ہے۔ یہاں کے غنڈوں کی سب سے بڑی کمزوری مذہب ہے۔ شاید اسی حقیقت کے پیش نظر کہا گیا تھا ؎:-

پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے

جہاں میں رہتا ہوں وہاں لوگوں کو ترقی کے راستے پر چلنا تو درکنار راستہ چلنا نہیں آتا۔ اس بات کی تصدیق کے لئے آپ ہمارے یہاں کی کسی بھی سڑک پر دس منٹ کھڑے ہو جائیں، آپ دیکھیں گے

کہ کچھ لوگ، قانون کے برعکس بائیں چلنے کے بجائے دائیں چل رہے ہیں کچھ لوگ دائیں بائیں آگے پیچھے دیکھے بغیر سڑک پار کرنے میں یا تو سائیکل والوں سے ٹکرا رہے ہیں یا رکشا اور موٹر سے بال بال بچ رہے ہیں۔ بعض کاندھے پر ڈنڈا نما چھڑی رکھے یا بغل میں چھتری دبائے اس انداز سے چلے جا رہے ہیں کہ ان کی چھڑی یا چھتری سے آگے پیچھے چلنے والوں کی آنکھ ناک دونوں زبردست خطرے میں ہیں۔ بعض لوگ چلتے چلتے بیچ راستے میں کسی سے ملنے کے لئے اچانک رک جاتے ہیں اور بین الاقوامی سیاست پر گفتگو شروع کر دیتے ہیں۔ یہ تمام باتیں صرف جاہلوں میں نہیں پڑھے لکھے لوگوں میں بھی پائی جاتی ہیں۔ در اصل ہمارے یہاں کے ناخواندہ اور تعلیم یافتہ لوگوں میں ایک ہی فرق ہے۔ وہ یہ کہ تعلیم یافتہ ناخواندہ نہیں ہوتے اور بس۔

جہاں میں رہتا ہوں وہاں کچھ عرصہ پہلے بہت سی سڑکوں پر جنھیں اخلاقاً سڑکیں کہا جاتا تھا یا تو گڈھے کھدے ہوئے رہتے یا روڑے جمع رہتے۔ ان گڈھوں اور روڑوں کو دیکھ کر تازہ وارد قسم کے لوگ یہ سمجھ بیٹھتے تھے کہ یہاں کی حکومت پبلک کے راستے میں یا تو گڈھے کھودتی ہے یا روڑے اٹکاتی ہے۔ در اصل وہ گڈھے

اور روڑے سڑکوں کی تعمیر کے لئے تھے۔ اس میں شک نہیں کہ حکومت سڑکوں کی تعمیر کی طرف کافی توجہ دے رہی ہے۔ لیکن بعض محققین کا کہنا ہے کہ نئی سڑکیں ردم جانے کی بجائے وزیروں کے دولت کدوں کی طرف چلی گئی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کسی سواری پر شہر کی شاہراہوں سے گزرتے وقت ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ہم شاہراہوں سے نہیں بلکہ زندگی کے نشیب و فراز سے گزر رہے ہیں۔

جہاں میں رہتا ہوں وہاں عام لوگوں کی خاص سواری یا تو ریل گاڑی ہے یا بس۔ ریل گاڑی میں عوام کے ساتھ خواص بھی سفر کرتے ہیں۔ مگر جہاں خواص فرسٹ کلاس اور سکنڈ کلاس میں سفر کرتے ہیں وہاں عوام انٹر اور تھرڈ کلاس میں۔ انٹر اور تھرڈ کلاس میں سفر کرنے والے ٹرین سے زیادہ آدمیوں پر سوار ہو کر سفر کرتے ہیں۔ یہی حال ہمارے یہاں کی بسوں کا ہے۔ بس کنڈکٹر جب تک ۲۵ آدمیوں کی سیٹ پر پچاس آدمی کو نہیں بٹھا لیتا اس وقت تک وہ اپنی بس کو خالی محسوس کرتا ہے۔ جس طرح ایک آدمی کی جگہ پر پانچ آدمیوں کو دعوت دینا بس کنڈکٹر کے فرائض میں داخل ہے۔ اسی طرح ایک آدمی کی جگہ پر پانچ آدمیوں کا گھس پڑنا ہمارے ہم وطنوں

کی عادات میں داخل ہے ممکن ہے یہ بات آپ کی سمجھ میں نہ آرہی ہو کہ آخر ایسا کیوں ہوتا ہے۔ لوگ اپنی اور دوسروں کی عافیت کا لحاظ کیوں نہیں رکھتے۔ لیکن ہمارے یہاں ایسی باتیں بے شمار ہوتی ہیں جو آپ کی سمجھ میں نہیں آسکتیں۔ جو کسی بھی متمدن آدمی کی سمجھ میں نہیں آسکتیں۔ مثلاً اگر آپ ہمارے یہاں کے سینما یا ریلوے اسٹیشن پر دس منٹ کھڑے ہو جائیں تو آپ کو ایک بہت ہی دلچسپ مگر سمجھ میں نہ آنے والا منظر دکھائی دے گا۔ یعنی انٹر اور تھرڈ کلاس کے ٹکٹ گھر کے سامنے آپ کو فلم بینوں یا مسافروں کا ایسا ہجوم نظر آئے گا۔ جنہیں قطاروں میں کھڑے ہو کر ٹکٹ خریدنے کی بہ نسبت ایک دوسرے کے شانوں پر کھڑے ہو کر یا ایک دوسرے کی ٹانگوں میں گھس کر ٹکٹ خریدنے میں زیادہ سہولت یا لذّت ملتی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ سہولت اور لذت آپ کی سمجھ میں ہرگز نہیں آسکتی۔

جہاں میں رہتا ہوں وہاں کسی نہ کسی پیمانے پر ہر قسم کا کاروبار ہوتا ہے۔ سب سے زیادہ فروغ لوٹ کھسوٹ کے کاروبار کو حاصل ہے۔ سچ پوچھیے تو ہمارے یہاں کاروبار کے معنی ہی لوٹ کھسوٹ کے ہیں۔ چنانچہ ہمارے یہاں بازار کم اور چور بازار زیادہ ہیں۔ روزمرہ استعمال کی ہر اچھی اور ضروری چیز مشکل سے ملتی ہے اور مہنگی ملتی ہے

بعض چیزیں مہنگی ہونے کے باوجود خالص ہرگز نہیں ملتیں۔ خالص چیزیں۔ فروخت کرنے میں منافع کم ہوتا ہے۔ اور منافع ایک ایسی چیز ہے کہ اس کے لئے ہمارے یہاں کا کاروباری طبقہ انسان کا گوشت تک بیچ سکتا ہے۔ لیکن چونکہ حکومت نے ابھی تک ایسے کاروبار کے لئے لائسنس جاری نہیں کیا اس لئے ہم لوگ ابھی صرف بکرے اور گائے کے گوشت پر گزارہ کر رہے ہیں۔

جہاں میں رہتا ہوں وہاں کی سب سے بڑی صنعت یا تو ہنگامے پیدا کرنا ہے یا بچے پیدا کرنا ایک کا تعلق سیاست سے ہے۔ اور دوسرے کا شریعت سے۔ دنیا کے دوسرے ممالک کے برعکس ہمارے یہاں سیاست اور شریعت ایک دوسرے سے بے تعلق نہیں۔ ہمارے یہاں جہاں کہیں سیاست کی گاڑی اٹکتی ہے شریعت اسے ڈھکیل کر آگے بڑھاتی ہے۔ اور جہاں شریعت سے کام نہیں چلتا وہاں سیاست ضرور کام آجاتی ہے۔ خیر یہ ایک ضمنی بات تھی۔ میں ذکر کر رہا تھا اپنے یہاں کی سب سے بڑی صنعت کا۔ بعض لوگ ہنگاموں اور بچوں کو گھر کی رونق سے تعبیر کرتے ہیں۔ ممکن ہے یہ تعبیر صحیح ہو۔ مجھے اس کا کوئی تجربہ نہیں۔ کیوں کہ جیل جانے کے ڈر سے میں نے کبھی ہنگاموں میں حصہ نہیں لیا اور مجرد ہونے کی بنا پر اب تک میں کوئی بچہ نہیں پیدا کر سکا ہے۔ لیکن مجھے کچھ ایسا

محسوس ہوتا ہے کہ ہمارے یہاں جن خصوصیات کے ہنگامے اور بچے جس کثرت سے پیدا ہو رہے ہیں۔ وہ ملک کے لئے رونق سے زیادہ بے رونقی کا باعث ہیں۔ ہنگاموں اور بچوں کی کثرت سے عاجز سبھی رہا کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ ان کے پیدا کرنے والے بھی۔ لیکن انہیں پیدا کرنے سے باز کوئی نہیں آتا۔ بچے پیدا کرنے والوں کا تو یہاں تک خیال ہے کہ اگر انہوں نے برتھ کنٹرول سے کام لیا تو گنہگار ٹھہریں گے یعنی برتھ کنٹرول گناہ ہے لیکن بچے پر بچے پیدا کرنا۔ ان کی پرورش و پرداخت تعلیم و تربیت، آرام و عافیت کا انتظام نہ کرنا یا نہ کرسکنا اور انسان نما وحشیوں کی تعداد میں اضافہ کرتا گناہ نہیں۔

مشرق کے ایک مشہور فلسفی شاعر نے کہا تھا کہ ع :-

جمہور کے ابلیس ہیں اربابِ سیاست

میں جہاں رہتا ہوں وہاں جمہور کے ابلیسوں کا آلۂ کار طالب علموں ــــــ کا طبقہ ہے۔ جو علم کے سوا ہر چیز کا طالب ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ پولس کے ہاتھوں پٹ جانے کا بھی جس طرح یہاں کے اربابِ سیاست کا پیشہ قوم کو نعرے فراہم کرنا ہے، اسی طرح یہاں کے طلبہ کا مشغلہ نعرے لگانا ہے۔ ہمارے یہاں کے طلبہ کی سب سے نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ وہ اس بات پر کبھی غور نہیں کرتے کہ وہ کیا کر رہے ہیں اور

کیوں کر رہے ہیں۔ انہوں نے سوچنے سمجھنے کا فرض سیاسی لیڈروں کے سپرد کر رکھا ہے۔ اُنہیں سوچنے سمجھنے کی زحمت سے اس قدر وحشت ہوتی ہے کہ وہ اپنے مستقبل تک کے بارے میں نہیں سوچتے اگر آپ کسی طالب علم سے پوچھیں کہ تعلیم سے فراغت پانے کے بعد کیا کرو گے تو جواب یہ ملے گا کہ ابھی تک میں نے کچھ طے نہیں کیا۔ وقت آنے پر دیکھا جائے گا۔ وقت آنے پر ہوتا یہ ہے کہ ادب اور فلسفے میں ایم اے کرنے والے طلبہ کلرکی کا عہدہ سنبھال لیتے ہیں اور بس۔

جہاں میں رہتا ہوں وہاں کے طلبہ میں علمی بھوک سے زیادہ جنسی بھوک پائی جاتی ہے۔ ان کی جنسی بھوک کی شدت کا یہ عالم ہے کہ وہ سنجیدہ سے سنجیدہ موقعوں پر شائستگی تک کا لحاظ نہیں رکھتے۔ حال ہی کی بات ہے کہ میں ایک یونیورسٹی کے کنووکیشن میں شریک تھا۔ ایک غیر ملکی سفیر طلبہ کو خطاب کرنے کے لئے آئے ہوئے تھے۔ کنووکیشن میں طلبہ کی نشستیں ایک طرف تھیں اور طالبات کی دوسری طرف۔ جب سند پانے والی طالبات کے ناموں کا اعلان کیا گیا تو بہت سے طلبہ طالبات کو دیکھنے کیلئے اس طرح اٹھ کھڑے ہوئے جیسے وہ زندگی میں پہلی مرتبہ لڑکیوں کو دیکھ رہے ہیں اور اس کے بعد پھر کبھی نہ دیکھیں گے۔

جہاں میں رہتا ہوں وہاں علوم و فنون میں سے سب سے زیادہ

قدر و قیمت سیاست و سازش کی ہے اور سب سے کم شعر و ادب کی۔ اگر کسی ثقافتی کانفرنس میں کسی موضوع پر ایک ادیب اور ایک سیاست داں کی تقریر ہو تو اخباروں میں ادیب کی تقریر کے چند جملے بھی شایع نہیں ہوتے اور سیاست داں کی تقریر کے ساتھ اس کی تصویر تک چھپ جاتی ہے۔ ہمارے یہاں ارباب قلم کو تخلیقی کاموں کے لیے اتنی فرصت و فراغت میسّر نہیں آتی جتنا تخلیقی کاموں کی بدولت فقر و فاقہ میسّر آتا ہے۔ اسی لیئے ان کی بیویاں ان پر اور وہ اپنی قسمت پر لعنت بھیجتے رہتے ہیں۔

جہاں میں رہتا ہوں وہاں لوگوں میں سیاسی تدبّر جتنا کم ہے سیاسی جماعتوں کی تعداد اتنی ہی زیادہ ہے۔ سیاسی جماعتوں کی دو قسمیں ہوتی ہیں، ایک وہ جو برسرِ اقتدار ہوتی ہیں، دوسری وہ جو درپئے اقتدار ہوتی ہیں۔ سیاست کی اصطلاح میں اول الذکر کو حکومت کہتے ہیں۔ اور موخرالذکر کو حزب مخالف، حزبِ مخالف کا کام ہر تحریک ہر تجویز میں حکومت کی مخالفت کرنا ہے اور بس چنانچہ جب کبھی برسرِ اقتدار جماعت یا جماعتیں گردشِ روزگار سے حزب مخالف بن جاتی ہیں تو وہ ان چیزوں کی بھی مخالفت کرنے سے باز نہیں آتیں جو دورانِ اقتدار میں خود اُن کے ہاتھوں عمل میں آئی تھیں۔

ہمارے یہاں سیاسی جماعتوں کے اراکین کی سب سے بڑی خوبی یہ ہوتی ہے کہ ان کا نقطۂ نظر جامد نہیں ہوتا۔ یعنی وہ آئے دن بدلتا رہتا ہے۔ اس تبدیلی کی بنا پر وہ ایک جماعت کو چھوڑ کر دوسری جماعت میں جا ملتے ہیں۔ دوسری جماعت کے انتخاب میں اس بات کا لحاظ نہیں رکھا جاتا کہ اس کے اغراض و مقاصد نسبتاً بہتر ہوں بلکہ اس بات کا خیال رکھا جاتا ہے کہ برسر اقتدار آنے میں اس کا امکان قوی تر ہو۔

جہاں میں رہتا ہوں وہاں اعلیٰ درجے کی سرکاری ملازمتوں کیلئے امیدواروں کا انتخاب ایک کمیشن کے ذریعہ سے ہوتا ہے۔ یہ کمیشن ملازمتوں کے اشتہار میں امیدواروں سے اُن تمام خصوصیات کا مطالبہ کرتا ہے جنہوں نے بقراط کو بقراط بنایا تھا لیکن امیدواروں کے انتخاب کے وقت کمیشن کی نظر صرف ان لوگوں پر پڑتی ہے جو بقراط ہوں یا نہ ہوں کسی بڑے آدمی کے بھانجے یا بھتیجے ضرور ہوتے ہیں۔

جہاں میں رہتا ہوں وہاں عام آدمیوں کی موت میں مرض سے زیادہ معالجے کو دخل ہوتا ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہمارے یہاں ڈاکٹر اناڑی ہوتے ہیں۔ خدا کے فضل سے ہمارے یہاں ایک سے

ایک اعلیٰ درجے کے سند یافتہ ڈاکٹر موجود ہیں۔ مگر وہ اپنے آپ کو زندہ رکھنے کے لئے مریض کو مرض میں مبتلا رکھنا ضروری سمجھتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جب مریض کو مرض سے نجات نہیں ملتی تو خود مرض کو مریض سے نجات مل جاتی ہے۔

جہاں میں رہتا ہوں وہاں مریضوں کے علاج کے لئے پرائیویٹ ڈاکٹروں کے علاوہ کئی ہسپتال بھی قائم ہیں۔ محتاط قسم کے مریض ہسپتال پر پرائیویٹ ڈاکٹروں کو ترجیح دیتے ہیں کیوں کہ ان کا خیال ہے کہ ہسپتال جانے کے معنی موت کی طرف پہلا قدم اٹھانے کے ہیں۔ محتاط مریضوں میں یہ بدگمانی اس بنا پر پھیلی ہوئی ہے کہ یہاں کے ہسپتالوں میں مریض بدست معالج اور مردہ بدست زندہ ایک ہی بات کے دو انداز بیان کی حیثیت رکھتے ہیں۔

جہاں میں رہتا ہوں وہاں لوگوں کے ذہن میں صفائی اور ستھرے پن کا اگر کوئی مفہوم ہے تو یہ کہ اپنے گھر کی گندگی اپنے قریب ترین پڑوسی کے دروازے پر ڈال دو۔ لوگ اپنے اپنے پڑوسیوں کے دروازے پر صرف کوڑا کرکٹ ہی نہیں ڈالتے بلکہ رات کی تنہائی اور تاریکی میں بعض اوقات اس سے بیت الخلا کا کام بھی لے لیتے ہیں۔ ہمارے یہاں راہ چلتے سڑک کے کنارے

پیشاب کرنا نہ ممنوع ہے نہ معیوب۔ غلاظتوں، کثافتوں، مکھیوں اور مچھروں سے ہماری زندگی کا کچھ اتنا گہرا رشتہ ہے کہ اگر آپ ان چیزوں کو ہماری زندگی میں سے گھٹا دیں تو صفر کے سوا کچھ باقی نہیں بچتا۔ خدارا ان باتوں سے یہ نہ سمجھئے کہ ہمارے یہاں میونسپلٹی کا وجود نہیں ہے۔ البتہ یہ بات ضرور ہے کہ ہمارے یہاں میونسپلٹی شہر کو صاف رکھنے کے لیے اُن ہی طریقوں پر عمل کرتی ہے۔ جن پر صفائی کے دشمن غلاظت پھیلانے کے لیے عمل کر سکتے ہیں۔ مثلاً ہمارے یہاں شہر کے بیت الخلاؤں کو صاف کرنے کے لیے ایک خاص قسم کی گاڑیوں سے کام لیا جاتا ہے۔ جو لکڑی سے بنائی جاتی ہیں اور جن کی شکل ڈھولنا ہوتی ہیں۔ ہر گاڑی ایک بیل کی مدد سے چلائی جاتی ہے۔ جس غلاظت کو انسان اپنے جسم سے خارج کرنے کے لیے بیت الخلا کی خلوت سے کام لیتا ہے اس غلاظت کو شہر سے خارج کرنے کے یہ گاڑیاں دن بھر اسے سر بازار لیے پھرتی ہیں۔ بعض اوقات گاڑیوں میں شگاف پیدا ہو جاتا ہے۔ اور اس صورت میں یہ گاڑیاں جس جس علاقے سے گزرتی ہیں نشانِ راہ چھوڑتی جاتی ہیں جس سے پیدل چلنے والوں کے پاؤں یا جوتوں کی پالش ہوتی رہتی ہے۔ یہ بات مہذب شہریوں کے لیے باعثِ ننگ ضرور ہے۔ لیکن جب خود

قدرت نے انسان جیسے اشرف المخلوقات کے جسم کو ایسی آلائشوں کا حامل بنانے میں شرم محسوس نہیں کی تو بیچاری میونسپلٹی کو ان آلائشوں کا اشتہار دینے میں شرم کیوں آئے۔

جہاں میں رہتا ہوں وہاں کے لوگ زندوں سے زیادہ مردوں کے، فرزانوں سے زیادہ دیوانوں کے اور سعی و عمل سے زیادہ دعا درود کے قائل ہیں۔ ہمارے یہاں کسی اہل کمال کی بھی قدر اس وقت تک نہیں ہوتی جب تک وہ مر نہیں جاتا۔ اسی طرح لوگ فرزانوں سے زیادہ دیوانوں سے عقیدت رکھتے ہیں۔ ہمارے یہاں سڑکوں پر مارے مارے پھرنے والے دیوانوں کے گرد نیازمندوں کا جو ہجوم رہا کرتا ہے وہ ہمارے یہاں کے ہر دانشمند اور مفکر کے لئے باعث رشک ہے۔ یہ بات یقیناً آپ کی سمجھ میں نہ آرہی ہوگی کہ دیوانوں کے گرد نیازمندوں کا ہجوم کیا معنی؟ تو صاحب بات یہ ہے کہ ہمارے یہاں لوگوں کو ہر مفکر کی ذات میں ماؤف الدماغ اور ہر ماؤف الدماغ کی ذات میں خدا رسیدہ بزرگ نظر آتا ہے، چونکہ ہمارے یہاں لوگوں کو خدا تک پہنچنے کا بڑا شوق ہے اس لئے وہ ہر اُس شخص کے پیچھے لگ جاتے ہیں جس پر انہیں خدا رسیدہ ہونے کا ذرا بھی شبہ ہو جاتا ہے

عام طور پر ان کی نگہ انتخاب کا مرکز کوئی پاگل ہی ہوا کرتا ہے۔ ایسا پاگل جس کا خدا تک پہنچنا تو ایک طرف اگر خدا بھی اس تک پہنچنا چاہے تو نہ پہنچ سکے۔ لیکن عقیدت کے کرشمے عجیب ہوتے ہیں۔

یہی حال اعتقاد کا ہے۔ ہمارے محلے میں جو حکیم صاحب رہتے ہیں وہ جلدی امراض کے مریضوں کو چھونے کے بعد کبھی ہاتھ نہیں دھوتے۔ ایک مرتبہ جب انہوں نے ایک ایسے ہی مریض کی نبض دیکھنے کے بعد میری نبض کی طرف ہاتھ بڑھایا تو میں نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا اور اُن سے درخواست کی کہ آپ ذرا اپنا ہاتھ تو دھولیں۔ اس پر انہوں نے فرمایا کہ آپ اطمینان رکھیں آپ کو کچھ نہ ہوگا۔ میں جلدی امراض والوں کو چھوتا ہوں تو ایک دعا پڑھ لیا کرتا ہوں۔ کیا عجب ایک دن ایسا بھی آئے جب وہ مریضوں کا علاج دوا کی بجائے صرف دعا سے کرنے لگیں اور اس صورت میں ہر مریض کی زبان پر یہ مصرع پایا جائے ع:-

مرض بڑھتا گیا جوں جوں دعا کی

جہاں میں رہتا ہوں وہاں خواص اور عوام دونوں کی تفریح کا بہترین ذریعہ فلم ہے۔ عام لوگ فلم کو تھیٹر کی طرح دیکھتے ہیں۔ یعنی جب انھیں کوئی منظر یا اداکاروں کی کوئی ادا پسند

آتی ہے تو تالیاں بجاتے ہیں بلکہ بعض اوقات Once more تک کہہ جاتے ہیں۔ ہمارے یہاں کی دیسی فلمیں اردو میں ہوتی ہیں، اور بقول شخصے اردو فلموں کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ جو باتیں دنیا کے پردے پر نظر نہیں آتیں وہ اردو فلموں کے پردے پر نظر آجاتی ہیں۔ اُردو فلموں کے کردار یا تو عاشقی کے درپے رہتے ہیں۔ یا خودکشی کے۔ انہیں خودکشی میں بھی اتنی ہی سہولیتیں میسّر آتی ہیں جتنی عاشقی میں۔ مثلاً جب ایک نوجوان گھر سے ملازمت کی تلاش میں نکلتا ہے تو اُسے ملازمت کی بجائے محبوبہ مل جاتی ہے۔ اور محبوبہ مل جانے کے بعد ملازمت کی ضرورت اس لئے باقی نہیں رہتی کہ اردو فلموں میں عشق۔ عاشقی کا مستقل پیشہ یعنی ——— ہمہ وقتی (WHOLE Time) ہوا کرتا ہے۔ جس طرح اُردو فلموں میں ہر رہرو کو راہ چلتے محبوبہ ہاتھ آجاتی ہے اُسی طرح اگر کسی صاحبِ فراش ——— مریض کا دل یہ چاہے کہ اب دوا کی بجائے زہر پی لینا چاہیئے تو اُسے دوا کی میز پر زہر کی شیشی بھی مل جاتی ہے۔

عام طور پر اردو فلموں میں خودکشی کے معنی زندگی کے خاتمے کے نہیں بلکہ ایک خوشگوار زندگی کی ابتدا کے ہوتے ہیں۔ وہ یوں کہ عین اُس وقت جب کوئی نوجوان زندگی کی مایوسیوں اور محرومیوں

سے تنگ آکر کسی پہاڑی کی چوٹی سے نیچے بہتے ہوئے دریا میں چھلانگ لگانے کے لیے پر تول رہا ہوتا ہے کسی کے حسین بازو اسے اپنے آغوش میں لے لیتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یوں سمجھیے کہ اردو فلموں میں آدمی کا سفر عاشقی سے خودکشی کی طرف نہیں بلکہ خودکشی سے عاشقی کی طرف ہوتا ہے۔ اس طرح خودکشی کا ارادہ یا خودکشی کی کوشش ایک ہولناک انجام کی بجائے ایک خوشگوار آغاز بن جاتی ہے۔ اردو زبان میں ایک مثل ہے کہ گانا اور رونا کسے نہیں آتا۔ ممکن ہے گانا اور رونا اپنی اپنی جگہ پر بالکل آسان ہوں لیکن ان دونوں کاموں کو ایک ساتھ انجام دینا یقیناً آسان نہیں اردو فلموں کے کرداروں کا کمال یہی ہے کہ وہ بیک وقت گاتے بھی جاتے ہیں اور روتے بھی جاتے ہیں وہ جس قدر زور سے گاتے ہیں اتنا ہی بلند آواز سے روتے ہیں۔ بعض اوقات اُن کے گانے اور چلانے میں کوئی فرق نہیں رہ جاتا۔ گانے اور چلانے میں فرق نہ کر سکنے یا اس فرق کو مٹا دینے کے میلان کا نتیجہ یہ ہے کہ اب اردو فلموں میں قوالی کو خاص طور پر جگہ دی جانے لگی ہے۔ عموماً مردانہ قوالی اور زنانہ قوالی ایک ساتھ ہوا کرتی ہے۔ جہاں مرد قوال کی آواز سے سماعت مجروح ہو جاتی ہے

وہاں عورت قوال کی شکل و صورت کو دیکھ کر ذوقِ نظر مجروح ہوتا ہے۔ ویسے اردو فلموں میں ذوقِ نظر کی تسکین کا خاص طور پر لحاظ رکھا جاتا ہے۔ اردو فلم کے ہدایت کاروں کا متفقہ نظریہ ہے کہ ذوقِ نظر کی تسکین کے لئے ہیروئن کے سینے کے ابھار سے بہتر دنیا میں اور کوئی شے نہیں۔ عام طور پر جو فلمیں جتنی زیادہ مہمل ہوتی ہیں اُتنی ہی زیادہ مقبول ہوتی ہیں۔ اس صورت حال کو سمجھنے کے لئے یہ فارمولا ہمیشہ یاد رکھیے۔

اردو فلموں کا معیار اتنا پست کیوں ہے؟

چونکہ پبلک کا فلمی مذاق نہایت پست ہے

پبلک کا فلمی مذاق اتنا پست کیوں ہے؟

چونکہ اُردو فلموں کا معیار نہایت پست ہے۔

جہاں میں رہتا ہوں وہاں بعض لوگوں کا ذوقِ موسیقی رات کے دس گیارہ بجے بیدار ہوتا ہے اور تین چار بجے تک بیدار رہتا ہے۔ وہ اپنے ذوقِ موسیقی کی تسکین کے لئے صرف گراموفون بجانے پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ اس میں Amplifier بھی لگا دیتے ہیں جس سے اردگرد کے محلے والوں کا ذوقِ موسیقی بیدار ہو یا نہ ہو اردگرد کے محلے والے ضرور بیدار ہو جاتے ہیں اور اس رات کی

نیند ان پر حرام ہو جاتی ہے۔ اگر کسی صاحب کے یہاں شادی کی تقریب ہو تو پھر کئی روز تک دن رات فضا موسیقی سے گونجتی رہتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں سمجھیے کہ ایک آدمی کی شادی بہتوں کے لئے شامت اعمال بن جاتی ہے۔ برات جب شہر سے گذرتی ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ برات نہیں بلکہ کسی سرکش ریاست پر دستی بم پھینکنے والوں کا گروہ جا رہا ہے جو از راہِ مشق سڑکوں پر پٹاخے چھوڑتا جارہا ہے۔ شادی کے موقع پر جو ریکارڈ بجائے جاتے ہیں ان میں اس کی تخصیص نہیں ہوتی کہ ان ریکارڈوں میں نشاط و مسرت کے گیت ہوں۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ ادھر گھر سے برات نکل رہی ہے اور ادھر ریکارڈ پر وہ گانا ہو رہا ہے جو ایک فلمی عاشق نے اپنی فلمی محبوبہ کے جنازہ نکلنے پر گایا تھا۔ کبھی کبھی تجارت پیشہ لوگ چور بازار کی آمدنی سے خوش ہو کر خدا کو خوش کرنے کے لیے اپنے گھر پر محفل میلاد یا قرآن خوانی کا انتظام کرتے ہیں قرآن خوانی کے انتظام کے معنی یہ نہیں کہ وہ خود قرآن پڑھتے ہیں بلکہ یہ کہ وہ کرایہ پر کسی حافظ کو بلوا کر قرآن پڑھواتے ہیں۔ اور اس کے منہ کے سامنے ایک مائک کھڑا کر دیتے ہیں۔ حافظ انتہائی تیزی کے ساتھ بالکل مشینی انداز میں قرآن پڑھتا چلا جاتا ہے۔ کبھی کبھی یہ سلسلہ دن دن بھر رہا کرتا ہے اور کبھی رات رات بھر۔ اگر آپ کسی متمدن ملک کے رہنے

والے ہیں تو مجھ سے ضرور پوچھیں گے کہ کیا ہمارے یہاں کوئی ایسا قانون نہیں جس کی رُو سے رات کے دس گیارہ بجے کے بعد مائک کا استعمال ممنوع ہو۔ تو صاحب بات یہ ہے کہ ہمارے یہاں ایسا قانون تو ضرور ہے لیکن جس طرح اور بہت سے قوانین ہمارے یہاں کس مپرسی کی زندگی بسر کر رہے ہیں اُسی طرح اس قانون کی طرف بھی کوئی توجہ نہیں دیتا۔

جہاں میں رہتا ہوں وہاں اور بھی بہت سی باتیں ہوتی ہیں جن کا ارتکاب جرم نہیں۔ لیکن اظہار جرم ہے۔ بعض ادیبوں اور صحافیوں کی شامت آتی ہے۔ تو وہ ان باتوں کا اظہار کر بیٹھتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان پر ریڈیو کے دروازے بند کر دیئے جاتے ہیں اور جیل کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں۔ ہمارے یہاں عملی طور پر جو شخص جتنا بے ضرر ہوتا ہے حکومت کی نظروں میں وہ اتنا ہی مشکوک ہوتا ہے۔ اور جو لوگ رات دن حکومت و ریاست کی بنیادوں کو ہلانے کے درپے رہا کرتے ہیں وہ نہ تو دن کی روشنی میں حکومت کے ہاتھ آتے ہیں نہ رات کے اندھیرے میں۔

زندگی کو خوبصورت اور خوش گوار بنانے سے جتنا انکار

ہمارے یہاں سے اتنا شاید ہی کسی اور ملک میں پایا جاتا ہو
سچ پوچھیے تو ہم زندگی کے قائل کبھی نہیں رہے۔ ہمارا فلسفۂ
زندگی اور نظریۂ حیات یہی رہا ہے کہ ہمیشہ موت کا خیال رکھو۔
اب فرق صرف اتنا ہے کہ موت کا خیال رکھنے کے بجائے ہم
نے خود زندگی کو موت کا مترادف بنا کے رکھ دیا ہے چونکہ یہ
دور نعروں کا ہے اس لئے آئیے ایک دفعہ نعرہ لگالیں۔ موت
زندہ باد۔ زندگی ——— مُردہ باد۔

۵۷ء ۱۹ء

دوست اور دوستی

بہت سی نعمتیں ایسی ہیں جن کے بغیر زندگی گزار لینا چنداں مشکل نہیں۔ لیکن کچھ نعمتیں ایسی ہیں جن کے بغیر زندگی بسر کرنا یکسر محال ہے۔ دوستوں کا وجود انہی نعمتوں میں سے ہے۔ یقین ملئے یہ بات اپنے دوستوں سے بددل یا بیزار ہو کر نہیں کہہ رہا ہوں۔ ویسے کون ہے جو اپنے دوستوں سے بددل یا بیزار نہیں رہتا۔؟

اوروں کی طرح میں نے بھی بہت سے دوست بنائے اور بہتوں کا دوست بنا۔ لیکن میں نے کسی کی دوستی کو سدا بہار نہیں پایا۔ اس بنا پر مجھے کچھ ایسا محسوس ہوتا رہا ہے کہ زندگی کی طرح دوستی کی

بھی ایک میعاد ہوتی ہے۔ جس طرح آدمی اپنی زندگی کی میعاد
سے واقف نہیں ہوتا اسی طرح دوست اپنی دوستی کی میعاد سے واقف
نہیں ہوتے۔ لیکن ہر دوستی کا چھوٹی بڑی میعاد پوری کرکے
ختم ہو جانا ناگزیر ہے۔ دوستی کے خاتمے کے معنی لازمی طور پر
دشمنی کی ابتدا کے نہیں ہوتے۔ بعض اوقات دوستی بغیر
عناد و عداوت کے تدریجی طور پر خاموشی کے ساتھ ختم ہو جاتی
ہے اور آپ محسوس کرتے ہیں کہ اب میرے فلاں دوست
اور میرے درمیان پہلی سی بات نہیں رہی۔ دوسرے لفظوں
میں یوں سمجھئے کہ اگرچہ اب ہم ایک دوسرے کے دشمن تو نہیں مگر
اب دوست بھی باقی نہیں رہے۔ یعنی اب ہم دونوں ایک دوسرے
کے شناسا رہ گئے۔ کتنی عجیب مگر کتنی دلچسپ بات ہے کہ صرف
شناسائی دوستی میں تبدیل نہیں ہوتی بلکہ دوستی بھی شناسائی میں
تبدیل ہوتی رہتی ہے۔ یہ اور بات کہ لوگوں کو اس کا احساس نہ ہو۔
دوستی کے خاموش خاتمے نے مجھے اکثر اس کا تجزیہ کرنے کی
ترغیب دی ہے۔ لیکن میں تجزیہ کبھی نہ کر سکا۔ البتہ زندگی کی
بے ثباتی سے زیادہ دوستی کی بے ثباتی پر اپنے دل میں تعجب اور
تاسف کی ملی جلی لہریں ضرور محسوس کرتا رہا ہوں چونکہ مجھے دوستوں

کے خاتمے سے زیادہ دوستی کا خاتمہ دیکھنا پڑا ہے۔ اس لیے اکثر سوچتا ہوں کہ آخر مجھ میں اور میرے دوست میں کون سی کمی تھی جس کی بنا پر ایک دوسرے کے ساتھ رات دن ملنے جلنے اٹھنے بیٹھنے، کھانے، پینے، گھومنے پھرنے کے باوجود ہم زیادہ دیر تک اور زیادہ دور تک ایک دوسرے کا ساتھ نہ دے سکے۔ بارہا ایسا بھی ہوا کہ لوگوں نے مجھے اپنا راز دار تک بنا لیا اور میرا راز دار بننے کی ہر ممکن کوشش کرتے رہے۔ پھر بھی میری ان کی دوستی کا وہی حشر ہوا جو پاکستان میں ہر نئی وزارت کا ہوتا ہے۔

زندگی کے بہت سے مرحلوں سے گزرنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ دوستی نباہ لے جانے کے لیے محقق شریف، شائستہ، معقول یا مرد معقول ہونا کافی نہیں۔ اس کے لیے بڑے دل گردے کا آدمی ہونا زیادہ ضروری ہے۔ سچ پوچھیے تو ہر دوست ایک مطالبے کی حیثیت رکھتا ہے۔ جب تک آپ اس مطالبے کو پورا کرتے رہیں گے دوستی قائم رہے گی۔ مثلاً کسی سے دوستی کا نباہ اس بات پر منحصر ہے کہ آپ انھیں قرض دیتے جائیں بغیر یہ سوچے ہوئے کہ یہ قرض کبھی واپس بھی ہوگا یا نہیں۔

کسی سے دوستی کا انحصار اس پر ہے کہ آپ انہیں اپنے قیمتی وقت کا خون کرنے کی اجازت دیدیں۔ وہ جس وقت بھی آٹپکیں آپ اپنا ضروری سے ضروری کام چھوڑ کر ان کا استقبال اس طرح کریں جیسے ان کے بغیر آپ ہر شے میں کسی شے کی کمی محسوس کر رہے تھے۔ بعض سے دوستی کے معنی صرف یہ ہوتے ہیں کہ آپ ہر روز ان کے فرضی معاشقے کی داستان سنیں اور اس پر ایمان لائیں۔ بعض کی دوستی اس بات کی طالب ہوتی ہے کہ آپ ان کے دفتری کارناموں کی داستان سنیں اور اس بات کے قائل ہو جائیں کہ اگر آپ کے دوست نہ ہوتے تو ان کا دفتر نہ چلتا اور اگر ان کا دفتر نہ چلتا تو یہ دنیا نہ چلتی۔ بعض کے نزدیک دوستی صرف یہ ہے کہ آپ اپنے ہر تیسرے فقرے میں ان کی ماں بہن کو گالی دیجئے یا پھر ان سے ہر جملے کی تمہید کے طور پر ماں بہن کی گالی سنئے۔ کسی سے نباہ کے لئے ضروری ہے کہ آپ انہیں دنیا کا سب سے ذہین مرد اور ان کی بیوی کو سب سے حسین عورت تسلیم کر لیں۔ غرض کہ جتنے احباب اتنے مطالبات۔ اور بقول غالب ؎ کس کی حاجت روا کرے کوئی۔ یعنی کس کس کا مطالبہ پورا کیا جائے۔

میرا خیال ہے اور غالباً آپ کو بھی اتفاق ہوگا کہ کسی سے لڑائی مول لینا اتنا دشوار نہیں جتنا کسی سے دوستی کو نباہ لے جانا۔ لڑائی مول لینے میں صرف اس بات کی احتیاط رکھی جاتی ہے کہ دشمن کا سر کٹے تو کٹے کم سے کم اپنا سر تو محفوظ رہے۔ لیکن دوستی کے نباہ میں معاملہ بالکل برعکس ہوتا ہے۔ یعنی اس میں اس بات کا لحاظ رکھنا پڑتا ہے کہ اپنا دل ٹوٹے تو ٹوٹے لیکن دوست کا دل ہرگز ٹوٹنے نہ پائے۔ خواہ بیوی سے رشتہ ٹوٹنے کے قریب کیوں نہ آجائے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس شخص سے زیادہ بدنصیب شاید ہی کوئی اور ہوگا جس کے احباب حد درجہ نامعقول ہوں اور جس کی بیوی حد درجہ معقولیت پسند۔ آپ سمجھ سکتے ہیں کہ ایسے آدمی کا حشر کیا ہوتا ہوگا۔ کیا عجب آپ میں سے کچھ لوگوں کو اس کا ذاتی تجربہ بھی ہو۔

ممکن ہے بعض لوگ میرے اس مضمون کو پڑھ کر یہ نتیجہ اخذ کریں کہ میرے خیال میں سب سے مشکل چیز دوستی کا نباہ ہے۔ لیکن یہ نتیجہ کچھ زیادہ صحیح نہ ہوگا کیونکہ جہاں تک نباہ کا تعلق ہے صرف دوستی ہی نہیں انسانی تعلقات کی اور جتنی بھی شکلیں ہیں میرے نزدیک ان سب میں نباہ مشکل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک قوم دوسری قوم سے، ایک فرقہ دوسرے فرقے سے، ایک ملک دوسرے ملک سے،

ایک حکومت دوسری حکومت سے الجھتی اور ٹکراتی رہتی ہے۔ اور تو اور میاں بیوی تک آپس میں الجھے اور ٹکرانے سے باز نہیں آتے۔ یورپ میں اس تصادم کا نتیجہ طلاق کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ ہمارے ملک میں میاں بیوی کا جھگڑا یا معاملہ طلاق کی صورت تک پہنچنے کے سوا باقی تمام حدود تک پہنچ جاتا ہے۔ چنانچہ یہاں ایسے میاں بیوی کی تعداد غیر معمولی ہے جن کے درمیان ازدواجی تعلقات اخلاقی تعلقات میں تبدیل ہو کر رہ گئے ہیں۔

یوں تو دوستی ہمیشہ نبھنے والی چیز نہیں۔ بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ بچپنا کے دوست بڑھاپے کے بھی دوست ثابت ہوں۔ لیکن جو دوستی زیادہ عرصے تک نبھتی ہے وہ بسا اوقات مشترکہ خوبیوں سے زیادہ مشترکہ کمزوریوں پر مبنی ہوتی ہے۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ آدمی کی خوبیاں یعنی اچھی عادتیں اتنی مستحکم نہیں ہوتیں جتنی بری عادتیں۔ چنانچہ دو نمازیوں کی دوستی اتنی دیرپا نہیں ہوتی جتنی دو شرابیوں کی۔ اس لئے کہ انسانی فطرت جو کچھ اور جیسی کچھ ہے اس کی بنا پر شرابیوں میں سے کسی کے نمازی بننے کا امکان اتنا نہیں جتنا نمازیوں میں سے کسی کے شرابی بن جانے کا۔ اور ظاہر ہے کہ جب دو نمازیوں میں سے ایک شرابی بن جائے گا تو نمازی

نمازیوں میں جانے گا اور شرابی شرابیوں میں۔ اگرچہ انسانی فطرت کسی کلیہ کو کلیتاً صحیح ہونے کا موقع نہیں دیتی۔ لیکن کند ہم جنس باہم جنس پرواز کے بڑی حد تک صحیح ہونے میں کیا شبہ ؟

بعض لوگ خود کسی کے دوست نہیں بنتے لیکن ہر کارآمد آدمی کو اپنا دوست بنا لیتے ہیں۔ ایسوں کے نزدیک دوستی اور خود غرضی میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ انہیں اس بات پر فخر ہوتا ہے کہ میں اپنے دوستوں سے کس کس طرح فائدہ اٹھاتا ہوں۔ وہ اپنی کار برآری کو اپنی ذہانت اور اپنے دوست کی حماقت دونوں کا نتیجہ سمجھتے ہیں۔ ایسے لوگ دنیا میں اگر کسی سے بیزار رہتے ہیں تو اپنے اُن دوستوں سے جو انہیں کی طرح ذہین یعنی مطلب پرست واقع ہوئے ہیں۔

شیکسپیر اور سعدی جیسے دانشمندوں کا قول ہے کہ دوست کا سب سے بڑا فرض دستگیری ہے۔ ہم میں سے اکثر دوستی کے اس معیار پر پورا اترنے کی کوشش کبھی نہیں کرتے لیکن اپنے دوستوں کو اس کسوٹی پر کسنے کے لئے ہمیشہ تیار رہتے ہیں۔ خصوصاً خود غرض قسم کے لوگوں نے شیکسپیر اور سعدی کے اس قول کا سہارا لے کر دوستی کو مستقل آزمائش بنا دیا ہے۔ ایسے لوگ ہمیشہ اپنے دوستوں کے خلوص اور صبر کا امتحان لیتے رہتے ہیں اور جب کبھی امتحان دینے کا

وقت آتا ہے تو اعلان کر دیتے ہیں کہ وہ کسی بیماری میں مبتلا ہیں یا
بیوی بچوں کی تیمارداری میں لگے ہوئے ہیں۔ میرے نزدیک دوستی
کے ساتھ دستگیری کا تصور غیر جمالیاتی نقطۂ نظر کا ترجمان ہے۔ لیکن ان کا
کیا علاج کہ دوستی کے معاملے میں دنیا ہمیشہ "ترقی پسند" رہی ہے۔ یعنی وہ دوستی
کے مسرت بخش ہونے سے زیادہ مفید ہونے پر زور دیتی رہی ہے حالانکہ ادب
اور آرٹ کی طرح دوستی کا پہلا اور بنیادی مقصد ذہنی مسرت کی فراہمی
ہونا چاہیے اور بس۔

بہت سے لوگوں کے نزدیک سچی دوستی کا ایک تصور یا تقاضا یہ بھی
ہے کہ دوست سے کوئی بات راز نہ رکھی جائے۔ میں نہیں جانتا کہ دوستی
کے اس تصور کو برتنے یا اس تقاضے کو پورا کرنے میں لوگ کامیاب ہوتے
ہیں یا نہیں۔ ممکن ہے ہوتے ہوں۔ لیکن ان لوگوں میں میرا شمار کبھی نہ
ہوا اور کیسے ہوتا جب کہ میرا یہ عقیدہ رہا ہے کہ آدمی کی زندگی میں بعض
باتیں ایسی بھی ہوتی ہیں جنہیں بن پڑے تو وہ اپنے آپ سے بھی چھپائے
چہ جائیکہ دوستوں سے۔ بہر حال اس میں شک نہیں کہ دوستوں سے اپنے
ہر راز کا اعتراف کر لینا نہ ممکن ہے نہ قرین مصلحت۔ چنانچہ ہر شریف
آدمی کی طرح میری بھی کوشش یہ رہی ہے کہ مجھ میں کمزوری اور کمینہ پن
کے جو چند عناصر ہیں انہیں دوستوں کی نظر سے محفوظ رکھوں۔ لیکن اس کوشش

کی بنا پر میرے بعض دوستوں کو میرے مخلص ہونے میں شبہ پیدا ہو گیا ہے ۔ یہ دوست وہ ہیں جو میری خواہش کے بغیر وقتاً فوقتاً مجھے اپنے راز بتاتے رہے ۔ غالباً اس امید میں کہ ایک دن میں اپنے سارے راز انہیں سونپ دوں گا لیکن جب ان کی توقع پوری نہ ہوئی تو انہوں نے مجھ پر غیر مخلص ہونے کی تہمت رکھ دی ۔

مجھے یہ دیکھ کر بہت کوفت ہوتی ہے کہ آج کی دنیا میں پرانی دنیا کی جن باتوں کو باقی رہنا چاہیے تھا وہ ختم ہوتی جا رہی ہیں اور جن باتوں کو ختم ہو جانا چاہیے تھا وہ جہاں کی تہاں موجود ہیں ۔ مثلاً پرانے زمانے کا یہ مقولہ آج بھی مقبول اور مستند ہے کہ آدمی اپنے دوستوں سے پہچانا جاتا ہے ۔ اگر آپ اس مقولہ کی صحت پہ غور کریں تو آپ کو یہ محسوس کرنے میں زیادہ دیر نہ لگے گی کہ آدمی کو پہچاننے کا یہ معیار غلط بھی ہے اور غیر منصفانہ بھی ۔ اس لیے کہ دوست بنانے میں سوچ سمجھ ، ارادے اور انتخاب سے زیادہ حالات و حوادث کو دخل ہوتا ہے ۔ اور یہ کون نہیں جانتا کہ کسی کو دوست بنا لینے یا کسی کا دوست بن جانے کے بعد اس کی بعض یا بہت سی برائیاں گوارا کر لی جاتی ہیں ۔ لیکن برائیوں کو گوارا کر لینے کے معنی ان کو قبول کر لینے کے نہیں ہیں ۔ ایسی صورت میں کسی کے متعلق اس کے دوستوں کی کمزوریوں کے پیش نظر پست رائے قائم کر لینے

ہیں آپ کیوں کر حق بجانب ہو سکتے ہیں۔ اسی لیے میرا تو خیال ہے کہ کہ آدمی صحیح طور پر اپنے دوستوں کی بجائے اپنے دشمنوں سے پہچانا جا سکتا ہے۔ دشمنی محض اتفاق کا نتیجہ نہیں ہوتی۔ انسان بہت سوچ سمجھ کر کسی کو اپنا دشمن قرار دیتا ہے۔ کسی شرابی کا دوست ہونے کے معنی خود شرابی ہونے کے نہیں۔ لیکن ایک معقول آدمی کو اپنا دشمن بنا لینا یا خود اس کا دشمن بن جانا اپنے نامعقول ہونے کی دلیل ضرور ہے۔ اسی لیے میری تجویز یہ ہے کہ آدمی اپنے دوستوں سے پہچانا جاتا ہے، والے صدیوں پرانے مقولے کو جس کا نقص پرانا ہونا نہیں بلکہ غلط ہونا ہے خیرباد کہہ دینا چاہیئے۔

کسی دانشمند یا دوست نزدہ کا قول ہے کہ دور کی صاحب سلامت اچھی میرا خیال ہے کہ دور کی صاحب سلامت ہی نہیں دوستی بھی اچھی ہوتی ہے۔ زیادہ قریب آنے کے بعد دوستی خطرے میں پڑ جاتی ہے۔ کم سے کم میرا تجربہ یہی ہے۔ حالی کا تجربہ بھی ایسا ہی تھا جبھی تو انہوں نے کہا ہے ؎

بڑھاؤ نہ آپس میں الفت زیادہ

مبادا کہ ہو جائے نفرت زیادہ

قربت واقعی انسانی تعلقات کے لیے سب سے بڑا خطرہ

اس لئے دوستوں ہی کو نہیں رشتہ داروں کو بھی ایک دوسرے کے قریب نہیں آنا چاہیے۔ خصوصاً جسمانی طور پر۔ یعنی دوستوں کا ایک ساتھ رہنا دوستی کو بڑھانے سے زیادہ گھٹانے میں مدد دیتا ہے۔ دوستوں ہی پر منحصر نہیں بلکہ کسی بھی دو یا دو سے زیادہ آدمیوں کا ایک ساتھ رہنا ان کے باہمی تعلقات کی ہمواری میں خلل انداز ہوتا ہے۔ اس کے اسباب ظاہر ہیں۔ ایک ساتھ رہنے میں کسی کی کمزوریاں کسی سے پوشیدہ نہیں رہتیں یا نہیں رہ پاتیں۔ اور انسان دیر تک دوسروں کی کمزوریوں کو نہ دیکھ سکتا ہے نہ سہہ سکتا ہے خصوصاً جب وہ اس کے آرام و عافیت میں مخل ہوتی ہوں۔ پھر چونکہ ہر دو آدمی کی پسند اور ناپسند ایک دوسرے سے بڑی حد تک مختلف ہوتی ہے۔ اس لیے بھی ایک ساتھ رہنا ذہنی کوفت سے لیکر اندرونی کشیدگی تک کا باعث بن جاتا ہے۔ ایک ساتھ رہنے والوں کے تعلقات میں جو بے کیفی اور بدمزگی پیدا ہوتی ہے اس کی بنیاد ان باتوں پر ہوتی ہے جو ایٹم کی طرح چھوٹی ہونے کے باوجود ایٹم بم کی طرح تباہ کن اور دور رس ہوتی ہیں۔ ایک ساتھ رہنے کے اسباب جتنے بھی خوشگوار ہوں اس کا انجام عموماً ناخوشگوار پایا گیا ہے۔ یعنی ایک ساتھ رہنا ایک ایسی کمیڈی ہے جو ٹریجیڈی پر ختم ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں Joint Family System کی بجائے ______

Separate Family System کا پرجوش حامی رہا ہوں بلکہ میرا تو یہاں تک خیال رہا ہے کہ میاں بیوی بھی الگ الگ مکان لے کر رہیں اور صرف تفریحاً یا ضرورتاً ایک دوسرے سے ملا کریں تو دنیا سے طلاق کا نام و نشان تک مٹ جائے۔

دوست اور دشمن میں فرق کرنے کی تمیز رکھنے کے باوجود یہ بات میری سمجھ میں نہیں آتی کہ دوست زیادہ برے ہوتے ہیں یا دشمن میری اس الجھن کا سبب یہ ہے کہ مجھے دوستوں کی صحبت میں دشمنوں سے زیادہ اُن دوستوں کی شکایتیں سننے کا اتفاق ہوتا رہا ہے جو وہاں موجود نہ تھے۔ ظاہر ہے کہ دوستوں کی ہر صحبت میں کچھ نہ کچھ دوست ضرور غیر حاضر رہتے ہیں۔ اس طرح مجھے اپنے تمام دوستوں کی شکایتیں سننے کا شرف حاصل رہا ہے۔ جن صحبتوں میں میں شریک نہ تھا ان کی روداد بھی میرے کانوں تک پہنچی ہے۔ یہ نہ پوچھئے کہ ان صحبتوں میں خود میرے متعلق کیا کچھ کہا گیا تھا۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ میرے متعلق جو کچھ کہا گیا اسے بیان کرتے ہوئے مجھے شرم آتی ہے۔ مجھے اندیشہ صرف اس کا ہے کہ اگر میں اسے بیان کر دوں تو میرے احباب کو شرمندہ ہونا پڑے گا۔ اور اگر معاملہ شرمندہ ہونے کا آپڑے تو خود مجھے بھی اپنے احباب سے کچھ کم شرمندگی نہ ہوگی۔ واقعہ یہ ہے کہ پیٹھ پیچھے دوستوں کی

شکایت کرنے میں جو مزہ ملتا ہے وہ دشمنوں کو گالی دینے میں بھی میسر نہیں آسکتا۔ اسی لطف و لذت کا نتیجہ ہے کہ دوستوں کی شکایت کرنے کے معاملہ میں ہم ہوئے، تم ہوئے کہ میر ہوئے، سب برابر کے گنہگار کی حیثیت رکھتے ہیں۔

خیر بات کہاں سے کہاں چلی گئی۔ میں کہہ رہا تھا کہ دوست زیادہ برے ہوتے ہیں یا دشمن یہ بات میری سمجھ میں نہیں آتی۔ اس کی ایک وجہ تو وہی ہے جسکا ذکر ابھی کیا گیا۔ یعنی یہ کہ دوستوں کے درمیان دشمنوں سے زیادہ دوستوں ہی کی شکایت سننے میں آتی ہے۔ دوسرا سبب میری الجھن کا یہ ہے کہ بے رحمی اور بے دردی کے اعتبار سے مجھے دوست دشمن سے کم نظر نہیں آتے۔ اس وقت تک دنیا کی توجہ دشمنوں کی بے رحمی اور بے دردی کی طرف اس حد تک مرکوز رہی ہے کہ دوستوں کی بے رحمی اور بے دردی کی طرف اس کا خیال ہی نہیں گیا۔ آپ ہی کہیے یہ پہلے درجے کی بے رحمی اور بے دردی نہیں تو اور کیا ہے کہ آپ کے ایک دوست آپ کی عزیز ترین کتابیں آپ کی لائبریری سے اٹھالے جاتے ہیں اور آپ ان سے پہلی مرتبہ ان کتابوں کی واپسی کا تقاضا کرتے ہیں تو آپ سے کہا جاتا ہے، یار معاف کرنا، وہ کتابیں میرے یہاں سے فلاں صاحب لے گئے۔ پرسوں ان کے یہاں جانا ہوگا تو لیتا

آؤں گا۔ اور جب آپ دوسری مرتبہ ان کتابوں کا تقاضا کرتے ہیں تو اطلاع ملتی ہے کہ وہ کتابیں فلاں صاحب کے یہاں سے فلاں صاحب کے یہاں پہنچ گئی ہیں۔ غرض کہ ہر نئے تقاضے پر آپ کو معلوم یہ ہوتا ہے کہ کتابیں دور سے دور تر ہوتی چلی جا رہی ہیں۔ یہاں تک کہ بہت دور چلی جاتی ہیں۔ آپ کے دوست کی پہنچ سے بھی دور۔ کیا آپ کے دوست کی یہ حرکت آپ کے اُس دشمن کی حرکت سے کچھ کم بے رحمانہ ہے جو دشمنی کی بنا پر آپ کے بچے کو غائب کر دیتا ہے یا کرا دیتا ہے۔ اور آپ اپنے اُس دوست کو کیونکر رحم دل کہہ سکتے ہیں جو یہ جاننے کے باوجود کہ آپ اپنے شکاری کتے کو دوسروں کی جان (اپنی جان نہیں) سے زیادہ عزیز رکھتے ہیں آپ سے وہ کتا مانگ بیٹھتا ہے۔ اگر وہ درد مند دل کا مالک ہوتا تو سوچتا کہ اس کتے کی جدائی آپ کے دل پر کتنی شاق گذرے گی۔ لیکن نہیں اسے اس بات کی ذرا بھی پروا نہ ہوگی چاہے آپ کتے کی جدائی میں دنیا سے گذر کیوں نہ جائیں۔ یار لوگ یاروں کا وقت ضائع کرنے میں جس بے رحمی اور بے دردی سے کام لیتے ہیں اس کا تجربہ کسے نہیں۔ اور آپ جانتے ہیں کہ کسی کا وقت ضائع کرنا اس کی زندگی کے ایک حصے کو ضائع کرنے سے کم نہیں۔ اب آپ ہی فرمائیں کہ جب دوستوں کا یہ رویہ ہو تو

ان میں اور دشمن میں کیا فرق۔ اگر کوئی فرق ہوگا بھی تو برائی کی مقدار کے لحاظ سے ہوگا نہ کہ اچھائی کے اعتبار سے۔ اسی لئے میں نے یہ سوال اٹھایا ہے کہ دوست زیادہ برے ہوتے ہیں یا دشمن ــــ؟۔

اس سوال کا جواب دوسروں کے پاس کیا ہے میں نہیں جانتا لیکن اتنا ضرور جانتا ہوں کہ دوست کو دشمن بنالینا احمقوں کا کام ہے۔ اور دشمن کو دوست بنالینا ارباب سیاست کا کارنامہ۔ بزرگوں کا خیال ہے در اصل یہ میرا ہی خیال ہے جسے میں بزرگوں سے منسوب کررہا ہوں کہ دشمن کو دوست بنالینا اتنا مفید نہیں جتنا دوست کو دشمن بنالینا مضر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اصحاب فراست اور ارباب سیاست دوست کو دشمن کبھی نہیں بناتے۔ البتہ دشمن کو دوست بنانے کے درپے ہمیشہ رہتے ہیں۔ چنانچہ ان کی دوست سازی کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ اب دنیا میں دشمنوں کی تعداد صرف دو رہ گئی ہے۔ باقی جتنے دشمن تھے وہ ان دشمنوں میں سے کسی ایک کے دوست بن گئے ہیں اور جو اس وقت تک نہیں بن سکے وہ عنقریب بن جانے والے ہیں۔ اب کوشش یہ ہورہی ہے کہ روئے زمین پر جو دو بڑے دشمن رہ گئے ہیں وہ بھی ایک میں تحلیل

ہو جائیں لیکن، آثار بتا رہے ہیں کہ اگر اس کوشش میں سنجیدگی یا شدت پیدا ہو گئی تو نتیجتاً خدائے واحد کے سوا اور کوئی چیز باقی نہ رہے گی۔ اس لیے میری آرزو (جسے مذہب کی اصطلاح میں دعا کہتے ہیں) یہ ہے کہ دشمنوں کی تعداد دو سے کم نہ ہونے پائے۔ خدا ان دونوں کو سلامت رکھے تاکہ باقی لوگ بھی سلامت رہ سکیں۔

۲۰ اکتوبر ۱۹۵۷ء

بور

لفظ ، بور انگریزی زبان کے ان لفظوں میں سے ہے جس کا مناسب اور مکمل بدل اردو میں نہیں ملتا۔ لیکن اس کے معنی یہ نہیں کہ اردو بولنے والوں میں بور نہیں ہوا کرتے۔ دراصل بور ہر زبان کے بولنے والوں، ہر مذہب کے ماننے والوں اور ہر ملک کے رہنے والوں میں پائے جاتے ہیں۔ انسانی تاریخ کے تمام ادوار اور دنیا کی تمام اقوام میں اور کوئی چیز مشترک ہو یا نہ ہو لیکن بور قسم کے لوگوں کا وجود یقیناً مشترک رہا ہے۔ ایک مشہور ادیب کا قول ہے کہ بور ذات پات کے بندھنوں سے آزاد ہوتے ہیں۔ مجھے اس قول سے اگر اختلاف ہے تو صرف اس لئے کہ میں نے ہر ذات کے بور دیکھے ہیں۔ یہاں تک

کہ بدذات قسم کے بوروں سے بھی میرا سابقہ پڑ چکا ہے۔

بعض لوگ اردو میں 'بور' کو مغز چاٹ کہتے ہیں۔ لیکن میں لفظ مغز چاٹ کو 'بور' کا مناسب اور مکمل بدل اس لئے نہیں سمجھتا کہ بور قسم کے لوگ صرف مغز ہی نہیں چاٹتے اور بہت کچھ چاٹ جاتے ہیں مثلاً میں اپنے تجربے کی بات کہہ رہا ہوں اور کیا عجب یہ آپ کا بھی تجربہ ہو کہ بور دماغ چاٹنے کے علاوہ قیمتی وقت سے لے کر قیمتی سگریٹ تک چاٹ جاتے ہیں۔ ممکن ہے یہاں آپ یہ کہیں کہ حضرت دماغ چاٹنا تو محاورہ ہے لیکن وقت چاٹنا اور سگریٹ چاٹنا محاورہ نہیں تو میں اس اعتراض کے جواب میں اتنا ہی عرض کروں گا کہ بات کہتے یا سنتے وقت محاوروں کے چکر میں نہ پڑیئے ورنہ یہ چکر کبھی آپ کا دماغ چاٹ جائے گا۔

دنیا میں جس طرح امیروں اور غریبوں کے طبقے ہیں اس طرح بور قسم کے لوگوں کا کوئی طبقہ نہیں۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ وہ لوگوں کے ہر طبقے اور ہر طبقے کے لوگوں میں پائے جاتے ہیں۔ اگر آپ برا نہ مانیں تو میں یہاں تک کہنے کو تیار ہوں کہ جس طرح ہر بچے کے اندر ایک آدمی پوشیدہ ہوتا ہے۔ اسی طرح ہر آدمی کے اندر ایک بور چھپا ہوتا ہے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ دنیا کے تمام لوگ ایک دوسرے کے پیٹھ پیچھے ایک دوسرے کو بور کہا کرتے ہیں۔ یعنی ہر آدمی اپنے سوا دنیا کے ہر آدمی کو بور سمجھتا ہے۔

یہ اور بات کہ کوئی آدمی ادنیٰ درجے کا بور ہوتا ہے اور کوئی اعلیٰ درجے کا۔ کوئی گمنام بور ہوتا ہے اور کوئی بدنام بور۔

جیسا کہ میں نے ابھی کہا دنیا کا ہر آدمی اپنے سوا دنیا کے ہر آدمی کو بور سمجھتا ہے۔ ممکن ہے آپ اسے مبالغہ سمجھتے ہوں لیکن میرے لئے یہ بات سر تا سر مشاہدے کی حیثیت رکھتی ہے۔ میں اپنے اس دعوے کے ثبوت میں بہت سی مثالیں پیش کر سکتا ہوں۔ مثلاً اگر آپ شام کے وقت دفتر سے فارغ ہونے کے بعد اپنے دوستوں سے ملیں اور گفتگو میں دفتر کی باتیں دفتر کی اصطلاحات میں بیان کرنے لگیں تو آپ کے تمام دوست آپ کو متفقہ طور پر بور سمجھنے لگیں گے۔ لیکن آپ کو بور سمجھنے والوں میں اگر کوئی شخص خود اس عادت میں مبتلا ہو تو وہ ہرگز اپنے آپ کو بور نہ سمجھے گا۔ اس سے ملتی جلتی ایک مثال اور لیجئے۔ فرض کر لیجئے آپ بعض دوستوں کے ساتھ کہیں جا رہے ہیں۔ راستے میں آپ کا کوئی اور دوست آپ کو اتفاقاً مل جاتا ہے۔ آپ اخلاقاً اس سے دو چار باتیں کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ ایسے موقع پر آپ کے ساتھ چلنے والے دوستوں میں سے ہر شخص کو آپ کے بور ہونے کا یقین آ جائے گا لیکن اگر یہی صورت حال ان میں سے کسی کو پیش آ جائے تو اُسے اپنے آپ پر بور ہونے کا شبہ تک نہ ہو گا۔ بعض اوقات لوگ جن باتوں کی بنا پر دوسروں کو بور کہہ دیتے ہیں اُنہی باتوں

کی بنا پر اپنے آپ کو بقراط سمجھ بیٹھتے ہیں۔ لیکن اس جملے سے یہ نتیجہ نکالنا صحیح نہ ہوگا کہ بور اور بقراط کے درمیان کوئی رشتہ قائم کیا جاسکتا ہے یہ اور بات کہ خدا ساز بور اور خود ساختہ بقراط میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔

ایک مشہور کہاوت ہے کہ بد اچھا بدنام برا۔ میں اس کہاوت سے واقف تو اس زمانے سے ہوں جب میں اسکول کا طالب علم تھا۔ اور مجھے امتحان کے پرچے میں کہاوتوں کو جملوں میں اس طرح استعمال کرنا پڑتا تھا کہ اُن کا مفہوم واضح ہو جائے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ میرے بنائے ہوئے جملے سے بد اچھا بدنام برا والی کہاوت کا مفہوم میرے مولوی صاحب پر واضح ہو سکا تھا یا نہیں لیکن خود مجھ پر اس کہاوت کا مفہوم اُس دن ظاہر ہوا جب بعض دوستوں کے ساتھ سیر کرتے ہوئے سر راہے ایک جید بور سے ملاقات ہو گئی۔ میں اپنے دوستوں کو حضرت بور کی بوریت سے بچانے کے لئے ان سے ذرا الگ ہو کر گفتگو کرنے لگا یا یوں سمجھئے کہ حضرت بور کی گفتگو سننے لگا۔ دراصل گفتگو سننے سے زیادہ میں اس بات کی کوشش کر رہا تھا کہ ان سے جلد گلو خلاصی ہو جائے۔ لیکن میری کوشش کارگر نہ ہو سکی۔ بہرحال جب ان سے نجات پاکر دوستوں کے پاس آیا تو انہوں نے بڑے غضب ناک لہجے میں کہا۔ یار تم سخت بور ہو، راہ چلتے بور کرتے ہو، میں نے جواب میں ٹھنڈی سانس بھر کر صرف اتنا کہا، بد اچھا بدنام برا، یاروں نے پوچھا، کیا مطلب؟ میں نے

جاتے ہوئے بور کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا، بور ہونے کی بدی تو ان کے حصے میں آئی ہے اور بدنامی میرے حصے میں۔

جو لوگ بور ہونے کی حیثیت سے مشہور و مستند ہو جاتے ہیں ان کی ایک ہولناک خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ ان سے ان کے ملنے والوں اور جاننے والوں کو نجات کسی قیمت پر میسر نہیں آتی۔ اگر آپ ان سے بچنے کے لئے گھر میں نہ ہونے کا بہانہ کریں تو کسی دن کسی وقت وہ آپ کو بازار میں گھیر لیں گے۔ اور اگر بازار میں ان کی نظر بچا کر اپنے گھر کی طرف بھاگیں تو گھر میں داخل ہونے کے پانچ ہی منٹ بعد وہ آپ کے دروازے پر دستک دیتے سنائی دیں گے۔ اس وقت آپ کو پتا چلے گا کہ آپ نے تو ان سے نظر بچائی تھی لیکن ان کی نظر آپ سے نہ بچ سکی۔ جب آپ بادلِ ناخواستہ دروازہ کھول کر ان سے ملیں گے تو وہ گفتگو بھی یہیں سے شروع کریں گے کہ بھئی! بہت دن ہو گئے تھے آپ سے ملے ہوئے جب بھی آپ کے یہاں آیا تو معلوم ہوا کہ آپ باہر گئے ہوئے ہیں۔ ابھی ابھی میں نے آپ کو نواب پور روڈ پر دیکھا تو خیال ہوا کہ اس وقت آپ گھر ہی کی طرف جا رہے ہوں گے۔ اتفاق سے آج مجھے چھٹی بھی ہے اس لئے میں نے سوچا کہ چلو ذرا اطمینان سے آپ ہی سے گپ شپ رہے۔ جب وہ اطمینان سے آپ کے یہاں بیٹھ جائیں گے تو پھر اٹھنے کا نام نہ لیں گے۔ انھیں اس بات کا ہرگز خیال نہ ہوگا کہ ان کی طرح آپ کا وقت بھی خالی ہے بھی یا نہیں۔ اور اگر بارہ بج چکے ہیں تو آپ کو کھانا کھانے

کی ضرورت محسوس ہو رہی ہو گی یا نہیں۔ آپ ان سے نجات پانے کی امید میں پان پر چائے کا اور چائے پر کھانے کا اضافہ کرتے چلے جائیں گے پھر بھی آپ انھیں جہاں کا تہاں موجود پائیں گے۔ آپ انھیں ٹالنے کے لئے خاموشی سے کام لیں یا خود فراموشی سے لیکن وہ دو تین گھنٹے وقت ضائع کئے بغیر ٹلنے کے نہیں۔ اگر ان کے پاس گفتگو کے لئے کوئی نیا موضوع نہ ہوگا تو وہ دہرائے ہوئے لطیفوں کو دہرانا شروع کر دیں گے یا پھر ہر بات میں اپنی ذات یا اپنے باپ دادا کی ذات سے مثالیں پیش کرتے چلے جائیں گے۔ وہ بھی غیر ضروری تفصیل کے ساتھ۔ اگر وہ تین بجے یہ خیال ظاہر کریں گے کہ اب چلنا چاہیے تو ساڑھے تین بجے کرسی پر سے اٹھیں گے اور آدھ گھنٹہ دروازے پر کھڑے ہو کر گفتگو کرنے کے بعد چار بجے دفع ہوں گے۔ ایسے لوگوں سے مل کر آدمی جسمانی طور پر تو جاں بحق نہیں ہوتا لیکن ذہنی طور پر جاں بحق ہونے کے تجربے سے ضرور آشنا ہو جاتا ہے۔

مستند قسم کے بوروں میں اور کوئی دل چسپ بات ہو یا نہ ہو لیکن ان کا ایک دوسرے کے پیٹھ پیچھے ایک دوسرے کو بور کہنا یقیناً دل چسپی سے خالی نہیں۔ ایک مرتبہ ایک مستند بور کے یہاں نشست ہو رہی تھی۔ باتوں باتوں میں ایک شاعر کا ذکر آیا تو انھوں نے فرمایا کہ میں نے انھیں اس لئے مدعو نہیں کیا کہ وہ بہت بور کرتے ہیں۔ میں ان کے اس جملے سے بے حد محظوظ

ہوا اور میں نے محظوظ ہو کر ان کے جملے پر اتنا اضافہ کر دیا:" اور اس کام کے لیے آپ کا وجود کافی ہے" لیکن اس سے بھی زیادہ دلچسپ واقعہ اُس دن پیش آیا۔ جب ایک بہت بڑے بور نے بڑے سنجیدہ لہجے میں مجھ سے کہا۔ "نظیر صاحب! میں آپ سے سخت بیزار ہوں۔ میں نے دبی زبان سے پوچھا۔ اب تک تو لوگ آپ کی جان عزیز سے بیزار تھے۔ آپ کو مجھ سے بیزار ہونے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ فرمایا۔ یہ ضرورت اس لئے پیش آئی کہ قوم کو آپ جیسے آدمی کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں نے کہا اور جناب کا اپنے متعلق کیا خیال ہے؟ کہنے لگے۔ میرا تعلق قوم سے اتنا نہیں جتنا قدرت سے ہے۔ اور قدرت کی مشیّت کے متعلق آپ کا کچھ کہنا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ اس لیے کہ آپ کا تعلق نہ مذہب سے ہے نہ مولانا مودودی سے۔ چنانچہ میں خاموش ہو رہا اور وہ دفع ہو گئے۔

بور کی قسمیں متعین کرنا مشکل ہی نہیں محال بھی ہے۔ بور انسان کے ہر طبقے اور علم و فن کے ہر شعبے میں پائے جاتے ہیں۔ آپ اپنی سہولت کے لئے بہت سے بوروں کے نام رکھ سکتے ہیں لیکن بہت سے بور ایسے بھی ہیں جن کا کوئی نام نہیں رکھا جا سکتا۔ مثلاً اگر کسی اسکول کے کوئی مولوی یا ماسٹر صاحب اپنے طالب علموں کو یہ بتائیں کہ غزل کے ہر شعر میں معشوق حقیقی کا ذکر ہوتا ہے تو آپ انھیں "تعلیمی بور" کہہ سکتے ہیں۔ یا اگر کوئی شخص کسی بڑے

لیڈر کی تقریر سے پہلے سامعین کا دل بہلانے کے لیے اپنی تقریر سے ان کی سمع خراشی شروع کردے تو آپ اسے سیاسی بور کا خطاب دے سکتے ہیں یا اگر کوئی شاعر کہے کم اور سنائے زیادہ یا اپنے اشعار سناتے وقت آپ سے داد کم لے اور خود ہی اپنے شعر کی زیادہ داد دے تو آپ اسے ادبی بور کہیں گے۔ لیکن آپ اس بور کو کیا کہیں گے جس کا خلوص یا جس کی خاکساری آپ کے اندر خودکشی کے جذبے کو بیدار کرتی ہو یا آپ کسی اسکول کے اس ہیڈ ماسٹر اور کسی کالج کے اس پرنسپل کو کس قسم کا بور کہیں گے جو طالب علموں کو تعلیم دینے سے زیادہ اُن کا امتحان لینے کے درپے رہا کرتا ہو اور اس بات کا ذرا بھی لحاظ نہ رکھتا ہو کہ طلباء کے علم کا امتحان لینے میں اساتذہ کے صبر کی بھی آزمائش ہو جاتی ہے یا آپ ان ایڈیٹروں کو بوروں کی کس صف میں رکھیں گے جو مشہور ادیبوں اور شاعروں کی بے جان چیزوں کو غیر معروف ارباب قلم کی جاندار تخلیقات پر ترجیح دیتے ہیں؟ یا آپ اس شخص کو کس قسم کا بور قرار دیں گے جو یہ دیکھنے کے باوجود کہ آپ آدھے درجن دوستوں کے ساتھ کہیں جا رہے ہیں آپ کو راستے میں روک کر آدھے گھنٹے تک مزاج پرسی کرنے لگتا ہے۔

میرے ایک دوست ہیں جو ہر چیز کا ڈانڈا ادب سے ملاتے ہیں۔ میرا کوئی ٹھیک نہیں کہ کس وقت کس چیز کا ڈانڈا کس چیز سے ملا دوں۔ غالباً میری اسی خوبی یا خامی کے پیش نظر ایک دن انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ ادب میں جمود کے

کیا معنی ہیں ۔ میں نے بے ساختہ جواب دیا کہ ادب میں بوریت کا دوسرا نام جمود ہے آپ جانتے ہیں کہ بے ساختہ جواب کا سوچ سمجھ سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ چنانچہ میرا یہ جواب بھی نہ سوچ سے تعلق رکھتا تھا نہ سمجھ سے لیکن مجھے یقین ہے کہ میرا یہ جواب آپ کو سوچنے کی بھی دعوت دے رہا ہوگا اور سمجھنے کی بھی۔

بعض اوقات بور کرنے والے کے بغیر بھی آدمی بور ہونے لگتا ہے۔ چنانچہ میں نے اپنے بعض دوستوں کو کہتے سنا ہے کہ "یار، گھر میں بیٹھے بیٹھے طبعیت سخت بور ہو رہی تھی۔ اسی لیے تمھارے پاس چلا آیا ہوں" لیکن ایسے احباب میرے پاس صرف آنے پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ مجھے بھی بور کرنا شروع کر دیتے ہیں اس میں ان کے ارادے کو دخل ہو یا نہ ہو انسانی نفسیات کے اس اصول کو ضرور دخل ہوتا ہے جس کی بنا پر کہا گیا ہے کہ افسردہ دل افسردہ کند انجمنے را۔ آپ چاہیں تو اس مقولے کو یوں بھی پڑھ سکتے ہیں کہ بور شدہ بور کند انجمنے را۔

بور کرنا ایک فن ہو یا نہ ہو لیکن حصولِ مقصد کا ایک حربہ ضرور ہے۔ بعض لوگ اس حربے کے استعمال میں طاق ہوتے ہیں۔ انھیں اس بات کا اچھی طرح اندازہ ہوتا ہے کہ کس آدمی کو کتنا بور کرنے سے کون سا فائدہ حاصل ہو سکتا ہے۔ چنانچہ بعض ادیب ریڈیو کے پروگرام انچارج کو بور کر کے ریڈیائی پروگرام حاصل

کر لیتے ہیں۔ بعض شعرا مشاعرے کے سکریٹری کو بور کرکے مشاعرے کا دعوت نامہ
حاصل کر لیتے ہیں۔ بعض بے روزگار لوگ بعض افسروں کو بور
کرکے ملازمت حاصل کر لیتے ہیں۔ اور لیڈر حضرات کا تو پوچھنا ہی کیا ہے۔
وہ قوم کو بور کرکے ووٹ سے لے کر وزارت تک حاصل کر لیتے ہیں۔ غرض کہ
بور بن جانا بھی عجیب نعمت ہے۔ یہ اور بات ہے کہ میرے ایسے لوگ اس نعمت
پر ہمیشہ لعنت بھیجتے رہتے ہیں۔

بور قسم کے لوگوں کا بدصورت یا بے وقوف ہونا ضروری نہیں۔ سچ
پوچھئے تو یہ کہنا بہت ہی مشکل ہے کہ ان کے لیے کیا کچھ ہونا ضروری ہے اور
کیا کچھ ہونا ضروری نہیں۔ مشاہدے نے مجھے بتایا ہے کہ بے وقوفوں سے عقل
کی باتیں سرزد ہوں یا نہ ہوں لیکن عقلمندوں سے حماقتیں اکثر سرزد ہوتی رہتی
ہیں پھر جب عقلمندوں سے حماقتیں ممکن ہیں تو حسین اور ذہین آدمیوں
کا بور ہونا کیونکر ناممکن ہو سکتا ہے۔ چنانچہ واقعہ یہ ہے کہ حسین اور ذہین
آدمی بھی بور ہوا کرتے ہیں۔ اگر آپ ذہین اور حسین نہ ہوں تو میں آپ کو
یہ بھی بتا دوں کہ حسین بور اور ذہین بور میں ایک چیز مشترک بھی ہوتی ہے۔
اس قدر مشترک کا نام ہے مظاہرہ۔ حسین آدمی اپنے حسن کے مظاہرے سے
بور کرتا ہے اور ذہین آدمی اپنی ذہانت کے مظاہرے سے۔

جس طرح آج تک اس بات کا فیصلہ نہ ہو سکا کہ محبت کی جاتی ہے یا

محبت ہو جاتی ہے اسی طرح غالباً قیامت تک اس کا بھی فیصلہ نہ ہو سکے گا کہ بور کرنے والے بور کرتے ہیں یا بور ہونے والے خواہ مخواہ بور ہوتے ہیں۔ اس بات کا فیصلہ مشکل یا محال یوں ہے کہ جن بیچاروں کو بور سمجھا جاتا ہے ان کی ہر بات اور ہر ادا بور ہونے والوں پر گراں گذرتی ہے۔ چنانچہ بور کرنے والے کبھی اپنی محبت سے بور کر جاتے ہیں اور کبھی اپنی عقیدت سے، کبھی اپنی حماقت سے اور کبھی اپنی ذہانت سے، کبھی اپنی صورت سے، اور کبھی اپنی سیرت سے، کبھی اپنے اخلاق سے اور کبھی اپنے اخلاص سے، کبھی خودستائی سے اور کبھی دوسروں کی مداح سرائی سے، کبھی اپنی سادگی سے اور کبھی اپنی سادہ لوحی سے، کبھی اپنے تکلف سے اور کبھی اپنی بے تکلفی سے، کبھی اپنے مذاق سے اور کبھی اپنی بدمذاقی سے، کبھی اپنے اصول سے اور کبھی اپنی بے اصولی سے، کبھی اپنے علم سے اور کبھی اپنی کم علمی سے، کبھی اپنے قد کی لمبائی سے اور کبھی اپنے دماغ کی چھوٹائی سے، کبھی اپنی سخن سنجی سے اور کبھی اپنی سخن فہمی سے، کبھی اپنی شاعری سے اور کبھی اپنی مضمون نگاری سے، کبھی ترنم سے غزل پڑھ کر اور کبھی تحت اللفظ مضمون سنا کر۔ کیا عجب کہ آپ خاکسار کے اس مضمون سے بھی بور ہو رہے ہوں اور تحت اللفظ پڑھنے سے بھی لیکن قبل اس کے کہ آپ کی زبان سے میرے لئے لفظ بور نکلے میں اپنی زبان بند کئے لیتا ہوں۔

۱۴ مئی ۱۹۵۵ء

پدرم فقیر بُود

یہ بات میں اپنے بارے میں نہیں کہہ رہا ہوں۔ میں اپنے بارے میں کہہ بھی نہیں سکتا کیونکہ میں تو ایک خوش حال باپ کا بدحال بیٹا ہوں۔

دراصل پدرم فقیر بُود والا فقرہ میں نے دوسروں کو کہتے سُنا ہے۔ وہ بھی ازراہِ اعتراف نہیں بلکہ ازراہِ افتخار۔ آپ کہیں گے ایسا ہو نہیں سکتا۔ افتخار کے طور پر تو آدمی پدرم سلطان بود کہتا ہے۔ پدرم فقیر بود کے فقرے میں افتخار کا پہلو کیا معنی؟

سچ پوچھئے تو یہ اعتراض عقل کی کمی سے زیادہ مشاہدے کی کمی پر مبنی ہے۔ یہ ممکن ہے کہ آپ نے کسی کو پدرم فقیر بود کا فقرہ افتخار کے طور پر کہتے نہ سنا ہو لیکن آپ نے یہ ضرور دیکھا ہو گا کہ ہر آدمی اپنے باپ کے سلطان ہونے ہی پر فخر نہیں کرتا بلکہ اور بہت سی چیزوں پر فخر کرتا ہے جن میں باپ

کا فقیر ہونا بھی شامل ہے یہیں سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ فخر کا جذبہ جتنا عالمگیر ہے فخر کا مسئلہ اتنا ہی پیچیدہ ہے۔

اس مسئلے کی پیچیدگی اس بات میں پوشیدہ ہے کہ آج تک انسان یہ طے نہ کر سکا کہ فی الحقیقت ہمیں کن چیزوں پر فخر کرنا چاہیے اور کن چیزوں پر نہیں۔ اس معاملے میں کسی فیصلے تک نہ پہنچنے ہی کا نتیجہ ہے کہ دو آدمی دو متضاد چیزوں پر فخر کرتے پائے جاتے ہیں۔ اگر ایک کو اس بات پر فخر ہے کہ اُس کا باپ سلطان تھا تو دوسرے کو اس پر فخر ہے کہ اُس کا باپ فقیر تھا۔ اگر ایک کو اس پر فخر ہے کہ وہ اپنے منہ میں چاندی کا چمچہ لے کر پیدا ہوا تھا تو دوسرے کو اس پر فخر ہے کہ وہ گدڑی کا لال ہے۔ اگر ایک کو اس پر فخر ہے کہ وہ محنت و مشقت کی زندگی سے کوسوں دور رہا ہے تو دوسرے کو اس پر فخر ہے کہ اُس نے ہمیشہ محنت و مشقت کی روٹی کھائی ہے۔ اگر ایک کو اس پر فخر ہے کہ اُس نے کبھی فرسٹ کلاس سے نیچے کے درجے میں سفر نہیں کیا تو دوسرے کو اس پر ناز ہے کہ اس نے کبھی تھرڈ کلاس سے اوپر کے درجے میں سفر کرنے کی خواہش تک نہیں کی۔ اگر کسی کو جان لینے پر فخر ہے تو کسی کو جان دینے پر ناز ہے۔ اگر کسی کو مال مست ہونے پر فخر ہے تو کسی کو حال مست ہونے پر ناز ہے۔ غرض کہ فخر کا کوئی معیار نہیں۔ جو شخص

جس چیز پر فخر کرنا چاہیے فخر کرسکتا ہے۔

اس بے اصولی کے نتائج خطرناک ہوں یا نہ ہوں دلچسپ ضرور ہیں۔ مثلاً آپ جانتے ہیں کہ ایک ادیب کے لیے صحیح زبان لکھنا باعثِ فخر ہے نہ کہ غلط زبان لکھنا۔ لیکن چونکہ فخر کرنے کے لیے اصول کی پابندی ضروری نہیں اس لیے ایک طرف ہمارے یہاں اہل زبان صحیح زبان لکھنے پر فخر کرتے ہیں تو دوسری طرف غیر اہلِ زبان غلط زبان لکھنے پر فخر کرتے نظر آتے ہیں۔ جہاں اہل زبان مصنفین اپنی غلطیوں کو کاتب کی کوتاہی کا نتیجہ قرار دیتے ہیں وہاں غیر اہلِ زبان مصنفین کاتب کی غلطیوں کو بھی اپنے نام سے منسوب کرنے میں تامل نہیں کرتے۔ مثلاً کنہیا لال کپور اپنی کتاب "چنگ و رباب" کے پیش لفظ میں لکھتے ہیں کہ "اس کتاب میں زبان کی متعدد غلطیاں بھی ہوں گی جن کی تمام تر ذمہ داری کاتب پر نہیں مصنف پر عائد ہوتی ہے"

فخر کے معاملے میں یہ بے اصولی کسی ایک طبقے سے مخصوص نہیں۔ زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جس میں متضاد قماش کے لوگ متضاد چیزوں پر فخر نہ کرتے ہوں۔ جہاں ایک متقی اور پرہیزگار کو اس پر فخر ہے کہ ؎ دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں، وہاں ایک عاصی اور گنہگار کو اس پر ناز ہے کہ ؎

دریائے معاصی تنک آبی سے ہوا خشک
میرا سرِ دامن بھی ابھی تر نہ ہوا تھا

سیاست کی دنیا میں بھی ایسی مثالیں نایاب نہیں۔ جب سر ظفر اللہ خاں پاکستان کے وزیر خارجہ کی حیثیت سے یو۔ این۔ او کے اجلاس میں کاشمیر کے مسئلے پر چھ چھ گھنٹے مسلسل تقریر کرتے تھے تو کم از کم پاکستانیوں کے دل خوشی سے پھولے نہ سماتے تھے کہ ہمارا نمائندہ اتنی طویل تقریر کر سکتا ہے۔ دوسری طرف جب ہندوستانی نمائندہ سر بینگل راؤ سر ظفر اللہ خاں کے چھ گھنٹے کی تقریر کا جواب دس منٹ کی تقریر میں دیتا تھا تو ہندوستانیوں کے دلوں میں فخر آمیز مسرت پیدا ہوتی تھی کہ ہمارا نمائندہ کتنی مختصر تقریر کرنے پر قادر ہے۔ اب جب یو۔ این۔ او کے اجلاس میں کرشنا مینن سر ظفر اللہ سے تین گنی زیادہ طویل تقریر کرتے ہیں تو ہندوستانیوں کو اس بات پر بھی فخر ہے کہ اُن کا نمائندہ طویل تقریر کرنے میں اپنا جواب نہیں رکھتا۔ اور اگر پاکستان کا نمائندہ سر بینیگل راؤ کی طرح مختصر تقریر کرنے لگے یا صرف اپنی خاموشی سے کرشنا مینن کی تقریر کا جواب دینے لگے تو ہم پاکستانی شاید اس کی، اختصار پسندی یا سکوت پسندی پر بھی فخر کرنے سے باز نہ آئیں گے۔

پتا نہیں میرا یہ خیال صحیح ہے کہ نہیں لیکن یہ خیال آئے دن میرے

ذہن میں آتا رہتا ہے کہ فخر کا جذبہ انسان کے اُن بنیادی جذبات میں سے ہے جن کی تسکین کے لیے وہ کوئی نہ کوئی صورت ضرور نکال لیتا ہے۔ چنانچہ مجھے بارہا یہ دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے کہ جن لوگوں کی زندگی قابل فخر کارناموں سے خالی ہے ان کی کوئی بات فخر سے خالی نہیں ہوتی۔ مثلاً بعض آدمیوں کو اس قسم کی باتوں پر بھی فخر ہوتا ہے کہ انہوں نے فلاں ادیب کی آنکھیں دیکھی ہیں یا فلاں لیڈر کی ڈانٹ سنی ہے یا فلاں عالم کی جوتیاں سیدھی کر چکے ہیں۔ بعض اپنی عقل پر فخر کرتے ہیں اور جن کی عقل فخر کئے جانے کے قابل نہیں ہوتی وہ اپنی نسل پر فخر کرکے اپنی خودی کو تسکین دے لیتے ہیں۔

ہر قسم کی کمزوری یا کمال پر بے سوچے سمجھے فخر کرنا صرف عام لوگوں کا شیوہ نہیں بلکہ غالب جیسے فلسفی شاعر تک کا فیصلہ ہے کہ ع۔

جس طرح کا بھی کسی میں ہو کمال اچھا ہے

لیکن مجھے یقین ہے کہ یہ بات کہتے وقت اس کے نتائج تک غالب کی نظر نہیں پہنچی۔ ہر قسم کے کمال کو اچھا یعنی قابل فخر قرار دینے ہی کا یہ نتیجہ ہے کہ خیر و شر کی ساری قدریں گڈمڈ ہو کر رہ گئی ہیں اور خیر و شر کی باہمی آویزش ختم ہونے میں نہیں آتی۔ کتنی عجیب بات ہے کہ جس دور میں برطانیہ کو اپنی جمہوریت اور روس کو اپنی اشتراکیت پر فخر ہوا اسی دور میں جرمنی اور اٹلی اپنی فاشیت پر ناز کریں۔ حالانکہ فاشیت وہ چیز ہے جس پر کسی ملک

یا قوم کو نازاں ہونے کی بجائے نادم ہونا چاہیئے۔ نادم ہونے کی جگہ نازاں ہونے کا نتیجہ دوسری جنگ عظیم جیسے المیہ کی صورت میں نکلا۔ لیکن انسان کی بدبختی ملاحظہ ہو کہ اس المیہ کے بعد بھی فخر کا کوئی آفاقی معیار قائم نہ ہوسکا البتہ فخر کا مرکز ضرور بدل گیا۔ یعنی اب دنیا کی بڑی قوموں یا بڑے ملکوں کو اپنی جمہوریت یا اشتراکیت پر اتنا فخر نہیں ہے جتنا خطرناک سے خطرناک آلاتِ حرب کی ایجاد پر۔ چنانچہ اگر ایک قوم کو اس پر فخر ہے کہ اُس نے ایٹم بم اور ہائیڈروجن بم ایجاد کر لیا ہے تو دوسری کو اس پر فخر ہے کہ وہ ایٹم بم اور ہائیڈروجن بم سے بھی زیادہ تباہ کن بموں کی ایجاد میں مصروف ہے۔ اس صورت حال کو دیکھ کر ایک واقعہ مجھے اکثر یاد آتا ہے جو لطیفے سے کم نہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ دو آدمیوں کے درمیان مال غنیمت کی تقسیم کے معاملے میں اختلاف رائے ہوگیا۔ اس پر ایک شخص بالکل مرنے مارنے پر تل گیا۔ مرنے پر کم مارنے پر زیادہ۔ جب دوسرے نے یہ رنگ دیکھا تو اس نے بھی آستینیں چڑھا لیں - اور اپنے فریق یا حریف کو للکارتے ہوئے کہا "بیٹا! ہمت ہے تو آجا۔ ہم تجھ سے کم حرامی نہیں ہیں" ظاہر ہے کہ جس دنیا کے انسانوں کو حرامی تک ہونے پر فخر ہوسکتا ہے وہاں امن عامہ ہمیشہ خطرے میں رہے گا۔ لیکن میرے نزدیک آج کی دنیا کا سب سے بڑا مسئلہ جنگ کا انسداد یا امن کا اہتمام نہیں بلکہ فخر کے صحیح اور حقیقی معیار کا

متعین کرنا ہے۔ اس میعار کے نہ ہونے ہی کی وجہ سے اگر ایک ملک کو اس پر فخر ہے کہ ہم نے ہائیڈروجن بم ایجاد کر لیا ہے تو دوسرے کو اس پر ناز ہے کہ ہم بھی اس کارِ خیر میں تم سے پیچھے نہیں۔ اگر ساری دنیا اس پر متفق ہوتی کہ انسانیت کو فائدہ پہنچانے والی چیزوں پر فخر کرنا چاہیئے اور نقصان پہنچانے والی چیزوں پر شرمندہ ہونا چاہیئے تو مجھے یقین ہے کہ ایٹم بم اور ہائیڈروجن بم بنانے والے اپنی اپنی ایجادوں پر شرمندہ ہوتے اور محسوس کرتے کہ ان ہلاکت آفریں ایجادوں پر فخر کرنا ایسا ہی ہے جیسے یہ کہنا کہ "بٹیا! ہم تجھ سے کم حرامی نہیں ہیں۔"

۲۴ اکتوبر ۱۹۵۷ء

آپ سے ملئے

(۱) پروفیسر کمال اوج قریشی

ع:۔ کوئی پوچھے کہ یہ کیا ہیں تو بتائے نہ بنے

لیکن جب تعارف کرانا ٹھہرا تو بتانا ہی پڑے گا کہ یہ کیا ہیں اور کیا نہیں ہیں۔ اچھا تو سب سے پہلے یہ بتا دوں کہ آپ ایک ہندوستانی یونیورسٹی میں لکچرار ہیں اور چونکہ اردو میں ہر لکچرار کو پروفیسر کہا جاتا ہے اس لئے آپ بھی لکچرار ہونے کے باوجود پروفیسر کمال اوج کہلاتے ہیں۔

شروع شروع میں اوج صاحب نے آپ کو کمال اوج قریشی کہتے بھی تھے اور لکھتے بھی تھے۔ لیکن پتا نہیں کس مصلحت یا مجبوری کی بنا پر ادھر کئی سال سے انہوں نے تین لفظوں کے بجائے دو لفظوں کے نام پر قناعت کر لی ہے۔ یعنی لفظ قریشی ان کے نام سے اڑ گیا بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ انہوں نے اسے

اڑا دیا ہے۔ بعض بد گمانوں کا کہنا ہے کہ انہوں نے لفظ قریشی اس لئے اپنے نام سے اڑا دیا کہ کہیں اس کی بنا پر ان کے متعلق کوئی غلط یا صحیح افواہ نہ اڑنے لگے۔ واللہ عالم بالصواب۔

اوج صاحب بھلی پوت کے رہنے والے ہیں۔ بھلی پوت پیلی بھیت اور لِلی پوت کے درمیان ایک شہر ہے۔ اوج صاحب جہاں اپنی ہیئت کے اعتبار سے بھلی پوت کی بہ سے مشابہ ہیں وہاں قد و قامت کے لحاظ سے یکسر للی پوتی واقع ہوئے ہیں۔ یعنے جتنے موٹے اتنے ہی چھوٹے۔ ایک دفعہ ایک بڑے مشاعرے میں مائک کے سامنے کھڑے ہو کر اپنا کلام سنا رہے تھے۔ ابھی مطلع ہی پر تھے کہ سامعین کی صف سے ایک آواز آئی "کھڑے ہو کر سنایئے کھڑے ہو کر" اس ستم ظریفی کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا کہ اوج صاحب اپنے پاؤں کی بجائے اپنے سر پر کھڑے ہو کر اپنا کلام سنائیں۔ ظاہر ہے کہ ایسا کسی قیمت پر نہیں ہو سکتا تھا۔ چنانچہ وہ اپنے پاؤں پر ہی کھڑے کھڑے مطلع سے مقطع تک پڑھ گئے۔

بڑے ہنس مکھ، زندہ دل، کم فہم، خوش اخلاق، بد طینت اور شگفتہ مزاج آدمی ہیں۔ انہیں ہم ذوق لوگوں کے درمیان بیٹھ کر باتیں کرنے اور چلئے پینے میں بڑا لطف آتا ہے۔ چائے کے ساتھ گپ شپ کو شعر و ادب کے تخلیقی محرکات میں شمار کرتے ہیں۔ لیکن اگر آپ ان کی شاعری میں چائے کی لذت اور

گرمی یا ان کے مقالوں میں گپ شپ کی سادگی اور سلاست ڈھونڈھیں گے تو آپ کو زبردست مایوسی ہو گی۔ وہ اپنے علمی مضامین میں بھی بڑی رنگین زبان استعمال کرتے ہیں۔ لیکن وہ رنگینی ایسی ہوتی ہے کہ قاری اس سے نہ کچھ پا سکتا ہے نہ اس میں کھو سکتا ہے۔

ابھی حال تک اوج صاحب کی ذات، لکچرار، نقاد، شاعر اور ڈرامہ نگار کا مجموعہ تھی۔ اب وہ ہدایت کار بھی بن گئے ہیں۔ فلم کے نہیں، اسٹیج ڈرامے کے۔ لیکن انہیں دیکھ کر ان پہ ہدایت کار سے زیادہ اداکار کا گمان ہوتا ہے۔ کون جانے ایک دن ایسا بھی آسکتا ہے جب وہ ہدایت کاری کی کی بجائے اداکاری پر آمادہ ہو جائیں۔ اگر ایسا دن آگیا تو پھر فلم دیکھنے والوں کو اردو فلموں میں گوپ کی کمی محسوس نہ ہو گی۔

وہ ترقی پسند بھی ہیں اور مقامی ترقی پسندوں کے امام بھی۔ اس بات کا فیصلہ خود ترقی پسندوں پر چھوڑتا ہوں کہ اوج صاحب ترقی پسند زیادہ ہیں یا امام زیادہ۔

اوج صاحب حلقۂ ارباب علم کے جلسے میں کسی کی بدنصیب نظم یا کسی کے بد اعمال مضمون پر اظہار خیال کرتے ہیں تو نہ خود اپنے قابو میں ہوتے ہیں نہ صدر جلسہ کے قابو میں۔ ہر دو جملے پر "یہ سمجھنا چاہیئے کہ" کا سہارا لے کر اتنی تیزی سے بولتے چلے جاتے ہیں کہ سننے والوں کو سمجھنا اور سمجھنے والوں کو یاد رکھنا مشکل ہو

جاتا ہے۔ بہت کچھ کہہ چکنے کے باوجود انہیں صدر جلسہ سے شکایت رہا کرتی ہے کہ انہیں کچھ کہنے کا موقع نہیں دیا جا رہا ہے۔ ایک دفعہ اکرام جوہر جلسے کی صدارت کر رہے تھے۔ جب انہوں نے کئی مرتبہ اوج صاحب کو یہ کہتے سنا کہ جناب صدر! مجھے کچھ کہنے کا موقع نہیں دیا جا رہا ہے تو انہوں نے اپنے مخصوص انداز میں مسکراتے ہوئے کہا۔ صاحب میں خود حیران ہوں کہ آخر یہ سارے موقع جا کہاں رہے ہیں۔"

اوج صاحب جھوٹ اخلاقاً بولتے ہیں اور سچ اتفاقاً۔ وہ یوں کہ مروت کے مارے اخلاقاً ہر آدمی سے ہر قسم کا وعدہ کر لیتے ہیں اور اتفاقاً کبھی کبھار کیا وعدہ پورا بھی کر دیتے ہیں۔ کبھی کبھار اس لئے کہہ رہا ہوں کہ ہر وعدے کو پورا کرنا کسی انسان کے بس کی بات نہیں۔

اوج صاحب لڑنا جانتے ہیں بگڑنا نہیں جانتے۔ یا یوں سمجھ لیجئے کہ انہیں بگڑنا آتا ہے بگڑے رہنا نہیں آتا۔ کم لوگ ایسے ہیں جن سے اوج صاحب کی شریفانہ لڑائی (یعنی ان بن) نہ ہو چکی ہو۔ لیکن جن لوگوں سے ان کی ان بن ہوئی ان میں ایسا کوئی نہیں جس سے اوج صاحب کے تعلقات ہموار نہ ہو گئے ہوں۔ واقعہ یہ ہے کہ ان کا دل ان کی شیروانی اور سوٹ سے زیادہ صاف رہا کرتا ہے۔

اوج صاحب اُن خوش نصیب بدنصیبوں یا اُن بدنصیب خوش نصیبوں

میں سے ہیں جو کبھی غمِ جاناں کا شکار ہوتے سنے گئے نہ کبھی غمِ دوراں میں مبتلا پائے گئے۔ ابھی تک تجرد کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ہر قسم کے خاندانی الجھیڑوں سے محفوظ تنہا رہتے ہیں اور تنہائی کے تمام لذائذ اور فوائد سے جی بھر کر اپنی زندگی کو سیراب کرتے اور شاداب رکھتے ہیں۔ وہ رند خوش اوقات ہوں یا نہ ہوں مرد خوش اوقات ضرور ہیں۔

۱۹۵۸ء

(۲) عارف دانش نگری

ہم سب لوگ عارف صاحب کو مولانا کہتے ہیں اور عارف صاحب اپنی بیگم کو مولانا کہہ کر پکارتے ہیں۔ ایک مرتبہ ان کے سالے نے ان کی تقلید میں اپنی بہن کو مولانا کہہ دیا۔ اس پر عارف صاحب نے تقریباً برافروختہ ہو کر فرمایا "واہ یہ کیا تک ہے۔ انہیں (بیگم کو) جو کچھ میں کہوں گا وہی آپ بھی کہیں گے اور جو کچھ میں کروں گا وہی آپ.........؟"

اس قسم کی فقرہ بازی اور حاضر جوابی مولانا کی شخصیت کا سب سے نمایاں پہلو ہے۔ اگر وہ ملک گیر شہرت کے مالک ہوتے تو ان کے لطیفے غالب اور ممتاز کے لطیفوں کی طرح زبان زد عام ہو گئے ہوتے۔

یوں تو مولانا کسی موضوع یا کسی موقع کے پابند نہیں لیکن اگر موضوع یا

معاملے کا رشتہ جنسیات تک پہنچتا ہو تو پھر دیکھیے انداز گل افشانی گفتار اکثر یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ اگر زیر بحث موضوع یا معاملے کا رشتہ پہلے سے جنسیات تک نہ پہنچا ہو تو مولانا کے فقرے اسے جنسیات تک ضرور پہنچا دیتے ہیں۔

ایک طرف مولانا کو جنسیات سے اتنا شغف دوسری طرف انہیں اپنی پاک دامنی کے قصے سنانے کا ایسا شوق کہ وہ یہ بھی محسوس نہیں کرتے کہ کہیں ان کی پاک دامنی کے واقعات انہیں پاک دامن سے زیادہ کچھ اور تو ثابت نہیں کر رہے ہیں ——— یعنی کہیں ایسا تو نہیں کہ ان کی پاک دامنی تر دامنی کی صلاحیت سے محروم ہونے کا لازمی نتیجہ ہے۔

مولانا بڑے وضع دار واقع ہوئے ہیں۔ میں نے ان کے مزاج اور لباس کو ہمیشہ یکرنگ و یکساں پایا۔ ان کی طبیعت میں جو تحمل اور بردباری آج سے دس سال (دس سال کی قید اس لیے کہ اس سے پہلے میں مولانا سے واقف نہ تھا) پہلے تھی وہی آج بھی ہے اور جس طرح میں نے ان سے متعارف ہوتے وقت انہیں شیروانی اور پاجامے میں ملبوس دیکھا تھا اسی طرح آج بھی انہیں ملبوس پاتا ہوں۔ البتہ شیروانیاں بدلتی رہی ہیں اور پاجامے بھی۔ لیکن شیروانی اور پاجامے کی جگہ شیروانی اور پاجامے ہی نے لی ہے۔ کوٹ اور پینٹ نے نہیں اور وہ ٹوپی جو پہلے بھی سر پر پہننے کی بجائے ان کے ہاتھ میں رہا

کرتی تھی اب بھی ہاتھ میں رہا کرتی ہے۔ اس ٹوپی کے ساتھ ہر روز کے دو ایک اخبار یا کوئی رسالہ یا کوئی کتاب ہوا کرتی ہے۔ ان چیزوں کے بغیر مولانا کا تصور ممکن ہی نہیں۔

مولانا ایک بہت بڑے مذہبی باپ کے بیٹے ہیں۔ اور عقیدے کی حد تک خود بھی مذہبی واقع ہوئے ہیں۔ جہاں تک نماز کا تعلق ہے میں نے مولانا کو تین ہی قسم کی نماز میں شریک ہوتے سنا اور دیکھا ہے۔ عید کی نماز بقرعید کی نماز اور جنازے کی نماز۔ جہاں تک روزے کا تعلق ہے مولانا خدا کے خوف سے زیادہ بیوی کی خاطر سے روزے رکھتے ہیں اور وہ بھی اس طرح کہ بیوی کے ساتھ سحری اور افطار میں شریک ہو لیتے ہیں اور باقی کمی ہوٹل میں پوری کر لیتے ہیں۔

کھیل، سیاست اور شاعری یہ تین چیزیں ان کی گہری دلچسپی کا مرکز رہی ہیں اور ایک شخصیت میں ان تینوں کا اجتماع ہم سب کی دلچسپی کا باعث بن سکتا ہے۔ تقسیم ہند سے پہلے مولانا کرکٹ کے اچھے کھلاڑی اور اپنے شہر کی مسلم لیگ کے سکریٹری رہ چکے ہیں۔ اب کھیل میں مولانا تماشا کی بجائے تماشائی کی حیثیت رکھتے ہیں اور سیاست میں عملی سیاست کی بجائے نظری سیاست پر قانع ہو گئے ہیں۔

مولانا کی شاعرانہ قوت کا بیشتر حصہ زمین کی ایجاد پر صرف ہوتا ہے۔

وہ نئی اور مشکل زمینوں میں شعر کہنے کے عادی ہیں۔ ان کی شاعری سے حکومت کو کوئی خطرہ ہو یا نہ ہو لیکن اپنی شاعری کی بدولت انہیں حکومت کی طرف سے اکثر خطرہ رہا کرتا ہے۔ وہ تو یہ کہیے کہ ارباب حکومت سخن فہم نہیں ورنہ مولانا سرکاری دفتر میں ملازم ہونے کے بجائے سرکاری مہمان خانے میں مہمان ملتے مولانا مشاعرے کے بڑے رسیا ہیں۔ مشاعرے میں شرکت کو اردو کی خدمت سمجھتے ہیں۔ تحت اللفظ پڑھنے کے باوجود مشاعرے میں بہت کامیاب رہتے ہیں۔ بلکہ اب تک ریڈیو پاکستان سے جتنے مشاعرے نشر ہوئے ہیں ان کے متعلق سننے والوں کے خطوط سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ مولانا سے زیادہ کامیابی کسی اور کے حصے میں نہیں آئی۔ اس کامیابی کا راز سمجھنا آسان ہو تو ہو بتانا یقیناً مشکل ہے۔

مولانا بڑے شگفتہ مزاج اور زندہ دل آدمی ہیں۔ عمر کے لحاظ سے جوانی اور بڑھاپے کے درمیان کھڑے ہیں۔ وہ بوڑھوں سے اتنے مانوس نہیں جتنا جوانوں سے اور جوانوں سے بھی زیادہ نوجوانوں کی طرف ملتفت پائے جاتے ہیں۔

ع۔ نظر اپنی اپنی پسند اپنی اپنی۔

مولانا بہت ہی مخلص اور بے ضرر واقع ہوئے ہیں۔ اپنی سادگی کے باوجود ان کی شخصیت دلکشی سے خالی نہیں۔ اور اب تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی شخصیت سے خود بھی مزے لینے لگے ہیں۔ چنانچہ اب انہوں نے اپنے

لطیفوں کو بار بار دہرانا شروع کر دیا ہے۔ خدا کرے اس تکرار کی بدولت ان کے لطیفے بے مزہ نہ ہو جائیں۔

۱۹۵۸ء

(۳) پروفیسر غیرت صابری

پروفیسر غیرت صابری ہمارے شہر کی واحد ادبی شخصیت ہیں جن کا یہاں کے ادبی حلقے سے کوئی تعلق نہیں۔ وہ یا تو پروفیسر کی حیثیت سے جانے پہچانے جاتے ہیں یا پھر کسی مقامی کاروباری ادارے کے کاروباری ہفتے وار رسالے کے ایڈیٹر کی حیثیت سے۔

پروفیسر کی حیثیت سے وہ یہاں کئی کالجوں میں کام کر چکے ہیں اور کئی کالجوں میں کام کر رہے ہیں۔ بعض کالجوں کو انہوں نے اُسی حیثیت اور اُن ہی حالات میں چھوڑا جس حیثیت اور جن حالات میں حضرت آدم نے جنت کو خیرباد کہا تھا۔ ان کالجوں سے غیرت صاحب کے نکلنے اور جنت سے حضرت آدم کے نکلنے میں جو مشابہت ہے۔ وہ اپنی جگہ پر دلچسپ سہی لیکن اس کی وضاحت کیا ضرور۔

غیرت صاحب اپنے تخلص کی بنا پر شاعر سمجھے جاتے ہیں۔ لیکن ادھر کچھ عرصے سے تنقید نگاری ان کی توجہ کی زد میں آگئی ہے۔ ڈاکٹر عرفانی نے

مجموعۂ کلام "بساط گذشتہ" پر انہوں نے تنقید عالیہ کا جو سلسلہ شروع کیا ہے اس سے اور کوئی فائدہ ہو یا نہ ہو اتنا تو ضرور ہوا کہ اردو تنقید اور رسالہ "ماہ نیم ماہ" (کراچی) دونوں اپنی انتہائی بلندی کو جا پہنچے۔ یہ اور بات کہ "ماہ نیم ماہ" کے ایک ایڈیٹر ابوالعنبر چشتی اس بلندی کی تاب نہ لاسکے اور عزت صاحب کے مضمون کی پہلی قسط کی اشاعت کے بعد انہوں نے عرفانی صاحب کے نام اپنے معذرت نامے میں لکھا کہ عزت صاحب کا لچر اور جاہلانہ مضمون ان کے علم کے بغیر شائع ہو گیا تھا۔ لیکن ابھی حال میں عزت صاحب کے مضمون کی دوسری قسط "ماہ نیم ماہ" ہی میں شائع ہوئی ہے اور ممکن ہے کہ یہ بھی ان کے علم کے بغیر شائع ہوئی ہو۔

عرفانی صاحب پر عزت صاحب کی ہجو کا جو سلسلہ شروع ہوا ہے اسے پڑھنے سے مدتوں پہلے راقم الحروف کو عرفانی صاحب پر عزت صاحب کا ایک نثری قصیدہ سننے کا اتفاق ہوا تھا۔ اس قصیدے کی حقیقت یہ تھی کہ اس زمانے میں عزت صاحب ایک ایسی ملازمت کے امیدوار تھے جس میں تقرر کا سارا دارومدار عرفانی صاحب پر تھا۔ عرفانی صاحب نے عزت صاحب سے تقرر کا وعدہ بھی کر لیا تھا۔ شاید اس وعدے کی خوشی میں یا اس وعدے کو مستحکم بنانے کے لیے عزت صاحب نے ضروری سمجھا کہ عرفانی صاحب کی تعریف میں ایک مضمون لکھ کر حلقۂ ارباب علم کے جلسے میں پڑھا جائے لیکن

تعریف ہو یا تنقیص اس کے لیے بھی سلیقے اور صلاحیت کی ضرورت ہے اور چونکہ
وہ ان دونوں چیزوں سے محروم ہیں اس لیے آپنے دوست اشعر راکوی کے
پاس پہنچے کہ بھائی عرفانی صاحب پر ایک خوبصورت سا مضمون لکھ دو۔ حلقے
میں پڑھوں گا۔ اشعر صاحب وعدہ کر کے انہیں دوڑاتے رہے۔ اتفاقاً اسی زمانے
میں انہیں ہندوستان جانے کی ضرورت آپڑی۔ اعصاب پر سفر سوار ہو تو مضمون
کیسے لکھا جا سکتا ہے۔ چنانچہ اشعر میرے پاس آئے اور مصر ہوئے کہ میں رات بھر
میں مضمون لکھ کر ان کے حوالے کر دوں تاکہ وہ صبح کو مضمون اپنے ہاتھ سے نقل
کر کے عزت صاحب کے حوالے کر دیں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا عزت صاحب نے
وہ مضمون حلقے کے جلسے میں پڑھا۔ اس کی تعریف و تنقید کرنے والوں میں
ہم دونوں بھی تھے۔ جو لوگ عزت صاحب کی صلاحیت اور قابلیت سے
واقف تھے ان کو اس مضمون پر وہیں سے شبہ پیدا ہوا اور ہم دونوں
پر مضمون کے مصنف ہونے کا گمان ہوتا رہا۔ اس واقعہ کے کچھ عرصہ بعد مجھے
خواہش ہوئی کہ میں اس مضمون کو دیکھوں۔ ایک دن بس میں اتفاقاً عزت
صاحب سے ملاقات ہو گئی۔ میں نے ان سے درخواست کی کہ عرفانی صاحب
سے متعلق اپنا مضمون ایک دو روز کے لیے عنایت فرمائیں۔ کہنے لگے لوگ میرے
مضامین لے جاتے ہیں تو واپس نہیں کرتے اور یہ مضمون میں نے بڑی محنت
سے لکھا ہے۔ اس لیے میں نہیں چاہتا کہ ضائع ہو۔ میں نے انہیں یقین دلایا کہ

مضمون ہرگز ضائع نہ ہوگا۔ اس پر انہوں نے مضمون دینے کا اخلاقی وعدہ کر لیا جو کبھی پورا نہ ہوا اور نہ ہیں نے اسے پورا کرانے کی کوشش کی۔

عرفانی صاحب پر عشرت صاحب کے تقیدے کا اثر کیا ہوا یہ وہ جانیں اور ان کا خدا جانے ہیں نے اتنا دیکھا کہ عشرت صاحب کو موعودہ ملازمت مل گئی جس کا اس تقیدسے کے بغیر بھی ملنا یقینی تھا۔

اب سے کئی مہینے پہلے عشرت صاحب کے ایک شاگرد کی زبانی معلوم ہوا کہ وہ عرفانی صاحب سے بہت خفا ہیں کیونکہ عرفانی صاحب انہیں یونیورسٹی کے امتحانات کا ممتحن نہیں بناتے۔ اور اب وہ عرفانی صاحب پر ایسی تنقید لکھنے والے ہیں کہ دنیائے ادب میں انہیں کہیں پناہ نہ ملے گی۔

چنانچہ اب وہ تنقیدی مضامین "ماہ نیم ماہ" کراچی میں شائع ہو رہے ہیں۔ ڈھاکے میں بہت سے لوگ یہ تک سوچنے سے باز نہیں آتے کہ عشرت صاحب اتنے لچر مضامین بھی لکھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں یا نہیں۔ آپ کہیں گے یہ صریحاً بدگمانوں کی بدگمانی ہے۔ بھلا جو شخص پروفیسر ہے وہ کیا اتنے لچر مضامین بھی نہیں لکھ سکتا۔ لیکن آپ کو کیا خبر کہ اردو میں کیسے کیسے پروفیسر پائے جاتے ہیں۔ یقین نہ آئے تو عشرت صاحب

ہی سے مل دیکھے۔

لغو اور مہمل تنقید سے قطع نظر عزت صاحب کے مضامین صرف اپنے ناشائستہ انداز بیان کی بنا پر اس قابل تھے کہ انہیں کسی رسالے میں جگہ دینے کی بجائے ردی کی ٹوکری میں جگہ دی جاتی۔ لیکن "ماہ نیم ماہ" نے ان مضامین کو شایع کر کے ثابت کر دیا کہ اس میں اور ردی کی ٹوکری میں کوئی فرق نہیں ہے۔

سنہ ۱۹۵۸ء

یہ انسان

کسی صحبت میں انسان کی آفرینش پر گفتگو ہو رہی تھی۔ اس سلسلے میں جب ایک صاحب نے کہا کہ انسان حضرت آدم کی نسل سے ہے تو ایک سیدھا سادہ نوجوان بول اٹھا۔ "لیکن ہمارے ابا جان تو کہہ رہے تھے کہ انسان بندر کی نسل سے ہے۔" اس پر ایک بزرگ نے اس نوجوان کو ڈانٹ پلاتے ہوئے فرمایا۔ "میاں صاحبزادے! خاموش رہو۔ یہاں گفتگو انسان کے بارے میں ہو رہی ہے نہ کہ تمہارے خاندان کے بارے میں۔"

اس جواب سے ارباب محفل نہ صرف محظوظ ہوئے، بلکہ بندر کے مقابلے میں اپنی برتری کے احساس سے مسرور بھی۔ مجھے ٹھیک سے نہیں معلوم کہ انسان حضرت آدم کے خاندان سے ہے یا بندر کی نسل سے۔ لیکن میں کچھ ایسا محسوس

کرتا رہا ہوں کہ اگر انسان بندر کی نسل سے نہیں ہے تو شاید یہ بات خود انسان کے لیے اتنا باعث فخر نہیں جتنا بندر کے لیے۔ اگر بندر انسان جیسی بدنصیب اور بے وقوف مخلوق کا مورث اعلیٰ نہیں تو اس میں اُس کا کیا نقصان ہے؟

انسان بڑا خود فریب اور خدا پرست واقع ہوا ہے۔ اُس نے خدا کو ماننے اور منوانے کے لیے ایسے ایسے دلائل تراشے ہیں کہ اس کی خدا پرستی بھی خود فریبی کی ایک شکل بن کر رہ گئی ہے۔ بہت سے لوگ تو جان بوجھ کر اس خود فریبی پر آمادہ ہو گئے ہیں۔ خود فریبی انسان کی عادت نہیں ضرورت بن چکی ہے۔ اسی ضرورت نے ایک مرتبہ کسی فلسفی سے کہلوایا تھا کہ اگر خدا نہیں ہے تو ہمیں ایک خدا پیدا کر لینا چاہیے۔ خدا کے وجود کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ اس کی بدولت محروم و مظلوم انسانوں کی تسکین اور اسرار کائنات کی توجیہ آسان ہو جاتی ہے چنانچہ انسان نے ایک نہیں سیکڑوں خدا پیدا کر لیے۔ اب سوچنے والوں کے لیے یہ سمجھنا مشکل ہو گیا ہے کہ انسان کا خالق خدا ہے یا خدا کا خالق انسان۔

خدا کے وجود کا مسئلہ بڑی حد تک شیکسپیر کے ڈراموں کے مسئلے سے مشابہ ہے۔ مہذب انسان اتنی مدت سے اتنی عقیدت اور ارادت کے

ساتھ شیکسپیر کی پرستش کرتا آرہا ہے کہ اب قدرتی طور پر اس کا جی نہیں چاہتا کہ شیکسپیر کے ڈرامے کسی اور کے ڈرامے ثابت ہوں۔ اسی طرح خدا کے وجود پر انسان کا ایمان اتنی مدت سے چلا آرہا ہے کہ وہ ایمان انسان کے شعور کا جزو بن چکا ہے اس صورت حال کا نفسیاتی تقاضا یہ ہے کہ اگر خدا کا وجود نہیں ہے جب بھی اس کا عدم وجود ثابت نہ ہو۔

خدا کی خوبی اور انسان کی کمزوری یہ ہے کہ جس طرح انسان خدا کے وجود کو ثابت نہیں کر سکتا اسی طرح وہ اس کے عدم وجود کو بھی ثابت کرنے سے قاصر ہے۔ جتنے مضبوط دلائل اس کے وجود کے ثبوت میں فراہم کیے گئے ہیں اتنے ہی موثر دلائل اس کے عدم وجود کے بھی ثبوت میں پیش کیے گئے ہیں نتیجہ یہ ہے کہ خدا کا وجود عقل کی بجائے عقیدے کا معاملہ بن کر رہ گیا ہے۔ اگر مانو تو سب کچھ۔ نہ مانو تو کچھ بھی نہیں۔ اس عقیدے پر عقل کے حملے ہمیشہ ہوتے رہے ہیں۔ لیکن اب تک عقیدہ ہمیشہ عقل پر غالب رہا ہے۔ مستقبل میں کیا ہوگا۔ کون جانے۔

خدا کو مان لینے سے انسان کی ذمہ داریاں بڑھ جاتی ہیں۔ نہ ماننے سے اندیشوں میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ خدا کو ماننے کے لیے عقل کا کمزور اور عقیدے کا مضبوط ہونا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ نہ ماننے کے لیے عقیدے

کا کمزور اور عقل کا مضبوط ہونا ضروری نظر آتا ہے۔ عقیدہ انسان کو اور کچھ دے یا نہ دے سکون ضرور عطا کرتا ہے۔ عقل انسان سے اور کچھ لے یا نہ لے سکون ضرور چھین لیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انسان کو عقل کے مقابلے میں عقیدے کا سودا زیادہ پسند رہا ہے۔

انسان کی ایک آفاقی خصوصیت یہ رہی ہے کہ ہر انسان جوانی میں عیاشی کرتا ہے اور بڑھاپے میں عبادت۔ جو لوگ اپنی جوانی کو عبادت میں ضائع کرتے ہیں وہ اپنے بڑھاپے کو عیاشی سے خالی نہیں جانے دیتے عیاشی اور عبادت انسان کے دو ایسے جسمانی اور روحانی امراض ہیں جن کا علاج ابھی تک سائنس بھی دریافت نہیں کر سکی ہے۔

دنیا کے ہر ملک میں انسان نے دوسروں کے حملوں سے اپنی حفاظت کے لیے قوانین بنا رکھے ہیں۔ ہر قانون کے کچھ مستثنیات بھی ہوتے ہیں۔ ہر انسان چاہتا یہ ہے کہ مستثنیات اس کے لئے ہوں اور قوانین دوسروں کے لیے۔

انسانی تاریخ کی بہت سی تعبیریں پیش کی گئی ہیں۔ میں ان تعبیروں کی تردید نہیں کرنا چاہتا۔ البتہ ان میں یہ اضافہ کرنا چاہتا ہوں کہ انسانی کی تاریخ جرأت اور حماقت کی تاریخ ہے۔ ویسے جرأت اور حماقت میں کچھ زیادہ فرق نہیں۔ ہر وہ جرأت جو ناکام رہتی ہے حماقت کہلاتی

ہے اور ہر وہ حماقت جو کامیاب ہو جاتی ہے جرأت تصور کی جاتی ہے۔

انسان ہمیشہ حق و باطل کے جھگڑوں میں گرفتار رہا ہے۔ یہ جھگڑے آج تک ختم نہ ہو سکے البتہ ان جھگڑوں کی بدولت ہر دور میں بے شمار انسانوں کا خاتمہ ضرور ہوتا رہا ہے اور آیندہ بھی ہوتا رہے گا کیونکہ انسان کے ذہن میں حق و باطل کا تصور یہ رہا ہے کہ اگر جیت اپنی ہو تو وہ حق ہے اور اگر دوسروں کی ہو تو باطل۔ ظاہر ہے کہ جیت اپنی ہو یا دوسروں کی ہمیشہ کسی ایک کی ہو گی۔ اس بنا پر حق و باطل کا جھگڑا یا حق و باطل کے نام پر انسانوں کا جھگڑا ہمیشہ جاری رہے گا۔

انسان وہ مخلوق ہے جس میں عقل کی کمی اور نیت کی خرابی کے تناسب کا اندازہ کرنا ممکن نہیں۔ آج تک یہ مسئلہ لاینحل رہا ہے کہ عقل کی کمی کے باعث اس کی نیت خراب رہا کرتی ہے یا نیت کی خرابی کے باعث وہ کم عقل نظر آتا ہے۔ دنیا میں ایسے واقعات بھی ہوتے رہتے ہیں جن میں نیت کی خرابی کم عقلی کا نقاب اوڑھ لیتی ہے اور ایک شخص کے اندر عقل کی کمی دوسرے کے اندر نیت کی خرابی کا باعث بن جاتی ہے۔

اخلاقی اعتبار سے انسان کی دو قسمیں بتائی جاتی ہیں۔ نیک اور بد یا مذہب کی اصطلاح میں معصوم اور گنہگار۔ عام عقیدہ یہ ہے کہ انسان دنیا میں معصوم آتا ہے اور یہاں سے گنہگار جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ

انسان معصوم پیدا ہوتا ہے اور ماحول کے اثر سے بدی میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اگر بدی کی طرح نیکی کا تعلق بھی انسان کی نیت اور ارادے سے ہے تو یہ بات غور طلب ہے کہ بچوں کو معصوم کہنا کہاں تک درست ہے۔ بچوں میں جس طرح بدی کی صلاحیت نہیں پائی جاتی اسی طرح نیکی کی صلاحیت بھی نہیں ہوتی ایسی صورت میں ان پر معصومیت کا لیبل لگانے کی بجائے کسی اور صفت کا لیبل کیوں نہ لگایا جائے۔ اگر بچے اور بچوں کے والدین برا نہ مانیں تو میں ایک بات اور بھی کہوں۔ وہ یہ کہ اگر موروثی خصوصیات (Hereditary characteristics) والا نظریہ صحیح ہے تو کسی بچے کو معصوم کہنے سے پہلے یہ بھی دیکھ لینا چاہیئے کہ اس کے والدین معصوم رہے ہیں یا نہیں۔

سیاسی اعتبار سے انسان کو دو طبقوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ غلام اور آزاد۔ غلام آزادی کے خواہش مند رہا کرتے ہیں اور آزاد حکمرانی کے آرزومند۔ غلاموں اور آزادوں کی اسی نفسیات نے ظالموں اور مظلوموں کے طبقے پیدا کئے ہیں۔ مظلوموں کو ظلم اور ظالموں سے نفرت ہوتی ہے مگر اسی وقت تک جب تک وہ خود مظلوم ہوتے ہیں۔ ظلم سے نجات پا کر انہیں ظالم بنتے دیر نہیں لگتی۔ مظلوم اور ظالم میں یا صید اور صیاد میں فطرت کا اتنا فرق نہیں ہے جتنا حالات کا۔

بعض فلسفیوں کے نزدیک بدی ناداری کا نتیجہ ہے۔ گویا بدی ناداروں کی مادی ضرورت ہے یا ضرورت کی تکمیل کا ذریعہ۔ بدی اور مادی ضرورت کا باہمی رشتہ مسلّم لیکن بہت سی برائیاں ایسی بھی ہیں جو فن برائے فن کے ماتحت آتی ہیں۔ ان کے ارتکاب میں ناداروں اور سرمایہ داروں کی کوئی تفریق نہیں۔ دونوں اپنی اپنی بساط کے مطابق جی بھر کر ان سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ یہ جاننے کے باوجود کہ برائیوں سے احتراز کا انعام اور ان کے ارتکاب کا انجام کیا ہے انسان برائیوں کی طرف زیادہ مائل رہا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ گناہ کے لذائذ نیکی کے فوائد سے زیادہ دلکش ہوتے ہیں۔

بدی کی طرف بے اختیار کھنچنے کے معنی یہ نہیں کہ انسان کے دل میں نیکی یا خیر کی کوئی وقعت نہیں۔ انسان نیکی یا خیر کا احترام ضرور کرتا ہے۔ لیکن اس کی افتاد طبیعت کچھ ایسی واقع ہوئی ہے کہ وہ نیکی یا خیر کا احترام کرنے کے باوجود اس سے محبت نہیں کر پاتا۔ انسان کی محبت کا مرکز بدی یا شر ہے۔ انسان نیکی کا احترام اس لئے کرتا ہے کہ اسے اپنا فرض سمجھتا ہے۔ بدی سے محبت اس لئے کرتا ہے کہ یہ اس کی فطرت ہے۔ انسان کے فرض و فطرت کا یہی تضاد ادب اور زندگی میں کمیڈی اور ٹریجیڈی دونوں کا مواد فراہم کرتا ہے۔

جنگ بازی انسان کی گھٹی میں پڑی ہوئی ہے۔ وہ ہمیشہ کسی نہ کسی بہانے

جنگ کرتا رہا ہے۔ کبھی اخلاق و مذہب کے نام پر، کبھی ملک و ملت کے نام پر، کبھی عورتوں کی عزت و عصمت کے نام پر اور کبھی اپنے وقار و وقعت کے نام پر۔ وہ جنگ کو ہمیشہ اپنی غیرت اور حمیت کا تقاضا سمجھتا رہا ہے۔ غیرت اور حمیت بھی عجیب چیزیں ہیں۔ اگر ایک ایسی سوسائٹی میں جہاں عورت مرد کے درمیان محبت سماجی اور اخلاقی جرم کی حیثیت رکھتی ہے کسی کو یہ معلوم ہو جائے کہ فلاں شخص میری بہن یا بیوی سے محبت کرتا ہے تو وہ اپنی غیرت اور حمیت کا ثبوت دینے کے لئے فوراً اس شخص کو قتل کرنے کے درپے ہو جاتا ہے چاہے وہ اپنی خلوتوں میں محبت سے بدرجہا بدتر جرائم کا مرتکب کیوں نہ رہ چکا ہو۔ انسان اگر اپنے گریبان میں منہ ڈالے تو بڑے سے بڑے مجرم کو بھی معاف کر دے۔ لیکن اس کا کیا علاج کہ وہ اپنے گریبان میں منہ ڈالنے کی بجائے دوسروں سے دست و گریباں ہونے کا زیادہ عادی رہا ہے۔

انسان کی تعمیر میں خرابی کی جو ایک صورت مضمر ہے اس کا نتیجہ یہ ہے کہ تمام اچھے اداروں میں وہ برائیاں پرورش پاتی ہیں جن کے خاتمے کے لئے ان اداروں کا قیام عمل میں آیا تھا۔ ممکن ہے بظاہر یہ بات غلط اور غیر ممکن معلوم ہوتی ہو لیکن اگر آپ تھانوں، عدالتوں، انٹی کرپشن ڈپارٹمنٹوں سے لے کر دنیا کی مختلف حکومتوں کی وزارت دفاع اور یو این او تک کے مقاصد اور اس کے طرز عمل پر نظر ڈالیں تو یہی غلط اور غیر ممکن بات صحیح اور ممکن

نظر آئے گی۔

یوں تو انسانوں کے بہت سے طبقے ہیں۔ لیکن ان میں ارباب مذہب ارباب سیاست، سائنس داں، فلسفی، ادیب اور شاعر ان لوگوں کے طبقے سب سے زیادہ ممتاز ہیں۔ ارباب مذہب کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ خدا کے نام پر خدائی کرنے کے فن میں بڑی مہارت رکھتے ہیں۔ سیاست دانوں کے بارے میں اقبال کا یہ قول غالباً حرف آخر ہے کہ ؎

جمہور کے ابلیس ہیں ارباب سیاست

اور جہاں ارباب سیاست جمہور کے ابلیس ہیں وہاں سائنس داں ارباب سیاست کے آلۂ کار۔ فلسفیوں کی سب سے دل چسپ خصوصیت یہ ہے کہ ان کے دعوے کمزور اور دلائل مضبوط ہوتے ہیں۔ فلسفی اور سیاست داں میں فرق یہ ہے کہ فلسفی نظریے کا قائل ہوتا ہے اور سیاست داں نعرے کا۔ جہاں فلسفی کو ہر نعرے میں کسی نظریے کی تلاش رہتی ہے وہاں سیاست داں کو ہر نظریے میں کسی نعرے کی جستجو رہتی ہے۔ ادیبوں اور شاعروں کی سب سے نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ انہیں زندگی بسر کرنے کا سلیقہ اتنا نہیں آتا جتنا اسے بیان کرنے کا۔ وہ جس قدر دوسروں کو زندگی سے لطف اندوز ہونے میں مدد دیتے ہیں اتنا خود لطف اندوز نہیں ہوتے۔ ارباب مذہب سے لے کر ارباب شعر و ادب تک تمام طبقوں میں کم از کم ایک بات ضرور مشترک

ہے۔ وہ یہ کہ سب کے سب اپنی اصلاح کے سوا باقی ہر ایک کی اصلاح کے درپے رہا کرتے ہیں۔

ایک روایت ہے کہ جب خدا نے انسان کو پیدا کرنا چاہا تو فرشتوں نے کہا کہ انسان بہت ہی فتنہ و فساد برپا کرے گا۔ اس لئے اسے پیدا نہ کرنا بہتر ہے۔ فرشتوں کے اندیشے تو صحیح ثابت ہو چکے۔ معلوم نہیں انسان کی تخلیق سے خدا کا مقصد پورا ہو سکا یا نہیں۔

۱۴ اکتوبر سنہ ۵۹ء

امتحان گاہ

اللہ والوں کے نزدیک تو یہ دنیا ہی ایک امتحان گاہ ہے۔ لیکن چونکہ میرا شمار اللہ والوں میں نہیں ہوتا اور نہ ہو سکتا ہے اس لیے امتحان گاہ سے میری مراد دنیا نہیں بلکہ وہ جگہ یا کمرہ ہے جہاں طلبہ امتحان دیتے اور اساتذہ امتحان لیتے ہیں۔ پہلے میں امتحان دینے سے ڈرتا تھا۔ اب امتحان لینے سے ڈرتا ہوں۔ وجہ یہ ہے کہ امتحان میں نہ صرف طلبہ کے علم کی آزمائش ہوتی ہے بلکہ اساتذہ کے صبر کی بھی۔ چنانچہ جب کبھی مجھے اپنے کالج کے امتحان کا کسی سے ذکر کرنا ہوتا ہے تو میں یہی کہتا یا لکھتا ہوں کہ آج سے ہمارے کالج میں طلبہ کے علم اور اساتذہ کے صبر کا امتحان شروع ہو گیا ہے۔ اساتذہ کے صبر کے امتحان کا مفہوم پورے طور پر وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جو خوش قسمتی یا بدقسمتی سے میری طرح اساتذہ کے زمرے میں شامل ہیں۔ امتحان سے پہلے پرچہ بنانا، امتحان کے

دوران میں نگرانی کرنا، امتحان کے بعد پرچے جانچنا، پرچوں کی جانچ کے بعد نمبروں کی فہرست تیار کرنا، ان میں سے کونسا کام ایسا ہے جو وقت طلب اور صبر آزما نہیں۔ خصوصاً نگرانی تو ایک ایسی سزا ہے جس میں قید بامُشقت کا مزہ مل جاتا ہے۔ یعنی اس سزا میں تین گھنٹے کی قید اور امتحان گاہ میں ٹہلتے رہنے کی مشقت دونوں شامل ہیں۔

لیکن سچ پوچھیے تو امتحان کا سب سے تکلیف دہ اور صبر طلب پہلو امتحان کی نگرانی نہیں بلکہ پرچوں کی جانچ ہے۔ امتحان کی نگرانی تین گھنٹے کی قید اور ٹہلتے رہنے کی مشقت کے باوجود دلچسپیوں سے خالی نہیں۔ امتحان گاہ میں انسانی فطرت اور اس سے زیادہ پاکستانی سیرت کے جو پہلو سامنے آتے ہیں وہ مشاہدے اور مطالعے کے لیے پُر لطف دعوت کی حیثیت رکھتے ہیں۔

اگلے وقتوں کے لوگ کہتے ہیں کہ ایک زمانہ وہ تھا جب امتحان کا نام سن کر کھلنڈرے طلبہ پڑھنے میں لگ جاتے تھے اور لکھنے پڑھنے سے شوق رکھنے والے طلبہ امتیازی کامیابی حاصل کرنے کے لئے دنیا و مافیہا سے منہ موڑ لیتے تھے۔ ممکن ہے طلبہ کا مؤخر الذکر طبقہ اب بھی ایسا ہی کرتا ہو لیکن جہاں تک طلبہ کے اول الذکر طبقے کا تعلق ہے آج کل اس کا طرزِ عمل کچھ اور ہے۔ جن طلبہ کو پڑھنے لکھنے سے سروکار نہیں (اور پاکستان میں اکثریت ایسے ہی طلبہ کی ہے) وہ ملک و قوم کے مسائل کو سلجھانے میں لیڈروں کا ہاتھ بٹاتے رہتے ہیں۔ امتحان

قریب آنے پر امتحان کی تاریخ بڑھوانے کے لیے ہڑتال سے لے کر بھوک ہڑتال تک میں حصہ لیتے ہیں۔ ششماہی امتحان کے وقت مختلف امراض میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور سالانہ امتحان کے وقت اپنے اساتذہ سے یہ دریافت کرنے کی بجائے کہ کیا کچھ پڑھنا چاہیے یہ معلوم کرنے کے درپے رہتے ہیں کہ اب کے امتحان کا مرکز اپنے کالج میں رہے گا یا کسی دوسرے کالج میں۔ اس تحقیق سے عقل کی کمی اور نیت کا فتور دونوں ظاہر ہیں۔ بہرحال جب ایسے طلبہ کو یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ امتحان کا مرکز اپنا ہی کالج رہے گا تو انہیں بڑا اطمینان ہو جاتا ہے کیونکہ وہ اپنے اساتذہ کے مزاج سے اچھی طرح واقف ہوتے ہیں اور انھیں اس کا اندازہ ہوتا ہے کہ امتحان گاہ میں کس پروفیسر سے کتنی نرمی یا سختی کی توقع کی جا سکتی ہے۔ یہ خوش خبری سننے کے بعد کہ امتحان اپنے ہی کالج میں ہوگا ایسے طلبہ پڑھنے سے زیادہ کتابوں اور نوٹوں کے ان اوراق کو پھاڑ کر جمع کرنا شروع کر دیتے ہیں جن میں متوقع سوالات کا جواب ہوتا ہے۔ امتحان کے دن ایسے طلبہ بظاہر مفلوک الحال یا مریض بنکر آتے ہیں۔ جن میں سے اکثر کے جسم پر چادر ضرور ہوتی ہے۔ چادر میں نہ صرف ان کا جسم لپٹا ہوتا ہے بلکہ ان کا علم بھی۔ بہت سے طلبہ اپنے علم و فضل کے سرمائے کو باتھ روم میں رکھ آتے ہیں اور امتحان کے دوران میں بار بار باتھ روم جانے کی اجازت طلب کرتے ہیں۔ ایسوں کو اجازت دیتے وقت میری زبان سے یہ فقرہ نکل جاتا ہے کہ اگر سوالات مشکل

ہیں تو ضرور جائیے۔

لیکن سبھی طلبہ اپنے سوالات بالکل ردم جاکر حل نہیں کرتے بہت سے دلیر اور دیدہ دلیر قسم کے طلبہ سوالات کا حل امتحان گاہ میں لے کر چلے آتے ہیں اور نگرانوں کی نظر بچا کر وہ سب کچھ کر دیتے ہیں جو انہیں نہیں کرنا چاہیئے۔ امتحان گاہ میں امداد باہمی کا جذبہ بڑی شدت کے ساتھ کار فرما ہوتا ہے۔ نگران کی تنبیہوں کے باوجود اچھے طلبہ کمزور طلبہ کو یعنی تیرنے والے ڈوبتوں کو بچانے سے باز نہیں آتے گو کبھی کبھار اس بھلائی کا انجام یہ بھی ہوتا ہے کہ ڈوبنے والے بچ جاتے ہیں اور بچانے والے ڈوب جاتے ہیں۔ امتحان سے متعلق قوانین پر سختی سے عمل ہو یا نہ ہو لیکن وہ بجائے خود ہوتے بڑے سخت ہیں، ان قوانین کی رو سے چار لفظوں سے مدد کرنے والے کی سزا وہی ہے جو چار صفحے چوری کرنے والوں کی ہے۔ یعنی دونوں کا ایک ایک سال برباد کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ ہوتا یہ ہے کہ بعض اوقات چار صفحے چوری کرنے والے گرفت میں نہیں آتے مگر چار لفظوں سے مدد کرنے والے زد میں آجاتے ہیں۔

امتحان گاہ کا نام لینے سے ذہن میں ایک ایسے کمرے کی تصویر آتی ہے جہاں بیسیوں طلبہ کے ایک ساتھ بیٹھنے کے باوجود مکمل سکوت طاری ہو اور ہر طالب علم لکھنے میں یوں مصروف ہو کہ امتحان کا کمرہ "کسے را باکسے کارے نباشد" کی تفسیر نظر آتا ہو۔ لیکن فی الحقیقت ایسا نہیں ہوتا۔ امتحان گاہ میں دو چار سنجیدہ

اور دیانت دار طلبہ کو چھوڑ کر باقی سب کے سب دائیں بائیں آگے پیچھے تاک جھانک اور کانا پھوسی کے درپے رہا کرتے ہیں۔ اصطلاح میں اسی حرکت کا نام چوری کرنا ہے۔ طلبہ کو چوری سے باز رکھنے کے لیے گوناگوں تدبیریں عمل میں لائی جاتی ہیں۔ انہیں طرح طرح کے اخلاقی اصول یاد دلائے جاتے ہیں۔ مثلاً ایمانداری بہترین اصول ہے۔ امتحان میں چوری کرنا اتنا ہی شرمناک فعل ہے جتنا کسی کے گھر میں چوری کرنا۔ دیانتداری سے فیل کر جانا چوری سے پاس کرنے کی بہ نسبت کہیں بہتر ہے۔ اپنی مدد آپ بہترین مدد ہے۔ اپنے دوستوں کی نقل نہ کرو۔ ان کا جواب غلط بھی ہو سکتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ جب اس قسم کے اخلاقی اصول اور نفسیاتی حربے کارگر نہیں ہوتے تو بعض کو عبرت آموز سزا بھی دی جاتی ہے۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود طلبہ چوری کرنے سے باز نہیں آتے۔ اس بنا پر یہ سوال اکثر میرے ذہن میں آتا ہے کہ جس قوم کے طلبہ دیانتداری کے ساتھ امتحان تک نہیں دے سکتے وہ دیانتداری کے ساتھ اور کون سا کام انجام دے سکتے ہیں۔ امتحان گاہ میں چوری اور ملک میں چور بازاری کے پیش نظر میرا یہ خیال مضبوط سے مضبوط تر ہوتا جا رہا ہے کہ پاکستانیوں کی قوم چوروں کی قوم ہے۔ یہاں طلبہ سے لے کر وزرا تک سب کے سب چور ہیں۔

چوری کرنے کے لیے بے حیائی اولین شرط ہے اور یہ صفت آج کل

کے طلبہ میں بدرجۂ اتم پائی جاتی ہے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ جب وہ پکڑے اور نکالے جاتے ہیں تو بغیر کسی ہچکچاہٹ کے بھرے کمرے میں نگراں کے قدموں پر گر کر معافی مانگنے لگتے ہیں۔ بعض اپنی شکل و صورت سے اتنے معصوم یا منقطع نظر آتے ہیں کہ ان کی طرف سے چوری جیسی ذلیل حرکت کا اندیشہ نہیں ہوتا بلکہ یہ حسن ظن پیدا ہو جاتا ہے کہ ایسے طلبہ اور جو کچھ کریں چوری ہرگز نہ کریں گے لیکن مشاہدے اور تجربے اس قسم کی خوش گمانی کی تردید کرتے رہے ہیں۔

ایک امتحان میں ایک صاحب ریش طالب علم کے متعلق مجھے کچھ ایسی ہی خوش گمانی ہو گئی تھی۔ چنانچہ تھوڑی دیر کے لئے میں ان کی طرف سے غافل ہو گیا۔ اس کے بعد ان پر جو اچانک نظر پڑی تو دیکھتا کیا ہوں کہ وہ ایک موٹی سی کتاب کچھ دامن کے اندر کچھ دامن کے باہر زانو پر رکھ کر لکھنے یا نقل کرنے میں مصروف ہیں۔ انہوں نے میرے دیکھنے کو دیکھ لیا اور کتاب کو دامن کے اندر سرکا لیا۔ اس کے بعد کسی قسم کی گھبراہٹ کا اظہار کئے بغیر لکھنے میں یوں مصروف ہو گئے جیسے ساری دنیا ٹھیک چل رہی تھی اور وہ خود بھی غلط راستے پر نہ تھے میں نے انہیں دور سے ٹوکنا مناسب نہیں سمجھا۔ اس لئے آہستہ آہستہ ٹہلتے ہوئے ان کے قریب گیا اور کہا "آپ جو کچھ کر رہے ہیں شریعت اس کی اجازت نہیں دیتی"۔ اس پر وہ بے اختیار کھلکھلا کے ہنس پڑے اور کتاب میرے حوالے کر دی۔

طلبہ امتحان میں چوری کیوں کرتے ہیں؟ اس سوال کے جواب میں اور جو کچھ بھی کہا جائے لیکن یہ ہرگز نہیں کہا جا سکتا کہ سوالات کی دشواری طلبہ کو چوری کرنے پر مائل یا مجبور کرتی ہے۔ سوالات کتنے ہی آسان کیوں نہ ہوں طلبہ چوری ضرور کریں گے۔ اس کا سب سے اہم سبب غالباً یہ ہے کہ طلبہ کی موجودہ نسل نے لکھنے پڑھنے کی قسم کھا رکھی ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ خوبی اور خوبصورتی کے ساتھ آسان سے آسان سوال کا جواب لکھنا تو ایک طرف اس کو سمجھنا بھی ان کے لئے آسان نہیں رہ گیا ہے۔ مجھے بارہا انٹرمیڈیٹ اور ڈگری کے امتحانات میں ایسے سوالوں کے معنی بتانے پڑے ہیں۔ جن کو سمجھنے میں آٹھویں نویں جماعت کے طلبہ کو بھی دشواری محسوس نہیں ہونی چاہیئے۔ امتحان گاہ میں یہ شورش اکثر اٹھتی دیکھی گئی ہے کہ سوالات مشکل ہیں اس لئے بدل دیئے جائیں ورنہ ہم امتحان نہیں دیں گے۔ طلبہ کی طرف سے اساتذہ کو اس بات کی داد شاید ہی کبھی ملتی ہو کہ سوالات آسان تھے۔ مجھے ایک مرتبہ ایسی داد ضرور ملی تھی۔ وہ بھی نہایت لاابالی اور کمزور طالب علم کی طرف سے سوالوں پر سرسری نظر ڈالتے ہی وہ کہہ اٹھا کہ اب کے سوالات بڑے آسان آئے ہیں۔ میں اس رائے سے مسرور بھی ہوا اور حیران بھی لیکن تھوڑی دیر کے بعد جب میں اس کے قریب سے گذرا تو دیکھا کہ آسان سوالوں کے جواب کتاب سے کاپی میں منتقل کئے جا رہے تھے۔ میں نے اس کے شانے کو تھپتھپاتے ہوئے کہا "یہ بات اب

میری سمجھ میں آئی کہ آپ کو سوالات اتنے آسان کیوں معلوم ہو رہے ہیں

جہاں تک مجھے اطلاع اور اندازہ ہے آج کل مشرقی پاکستان کے امتحانوں میں سوالوں کے جواب کی اسمگلنگ اسی پیمانے پر ہو رہی ہے جس پر مشرقی پاکستان اور ہندوستان کے سرحدی علاقوں میں اسمگلنگ کا کاروبار جاری ہے۔ طلبہ جوابات کی اسمگلنگ کے لئے بہت سی سہولتیں خود فراہم کر لیتے ہیں۔ بعض سہولتیں انہیں اتفاقاً میسر آجاتی ہیں۔ ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ سوالات کے پرچے گھٹ گئے۔ اس لئے کچھ طلبہ سے کہا گیا کہ ایک پرچے میں دو دو طالب علم شریک ہو جائیں۔ اس انتظام کا سہارا لے کر طلبہ نہ صرف ایک دوسرے کے سوالات میں شریک ہو گئے بلکہ ایک دوسرے کے جوابات میں بھی شریک بننے کی کوشش کرنے لگے۔ بالآخر مجھے اعلان کرنا پڑا کہ سوالات میں شرکت کے معنی جوابات میں شرکت کے نہیں ہیں۔

یہ بات یقیناً حیرت انگیز ہے کہ جوابات کی ساری اسمگلنگ کے باوجود امتحان کا نتیجہ تیس چالیس فیصدی سے زیادہ کیوں نہیں ہوتا۔ میں اکثر سوچتا ہوں کہ اگر پوری دیانت داری کے ساتھ امتحان دیا اور لیا جائے تو نتیجہ کیا رہے گا۔ لیکن سچ پوچھیے تو موجودہ حالات میں پوری دیانت داری کے ساتھ نہ امتحان دینا ممکن ہے اور نہ امتحان لینا۔ آج کل امتحان میں طلبہ کی کامیابی طلبہ سے زیادہ تعلیمی اداروں کا مسئلہ بن گئی ہے۔ یعنی اسکول

طلبہ کو پاس کرنے کی فکر اتنی نہیں ہوتی جتنی تعلیمی اداروں کو انہیں پاس کرانے کی فکر رہا کرتی ہے۔ خصوصاً پرائیویٹ کالجوں کو جن کی بقا بڑی حد تک امتحان میں زیادہ سے زیادہ طلبہ کی کامیابی پر منحصر ہے۔ اگر پرائیویٹ کالج اچھے نتائج نہ پیدا کریں تو نہ حکومت ان کی کوئی مدد کرے گی نہ طلبہ کی کثیر تعداد ایسے اداروں میں پڑھنے پر آمادہ ہوگی۔ یہی وجہ ہے کہ امتحان میں نگرانی کے فرائض انجام دینے والوں کو پرنسپل صاحبان اس قسم کی ہدایت ضرور دیتے ہیں کہ نرمی سے ہرگز کام نہ لیجئے گا اور سختی کو بھی راہ نہ دیکھئے گا۔ یہی وجہ ہے کہ امتحان گاہ میں امتحان سے متعلق تمام قوانین پر عمل درآمد نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ امتحان طلبہ کے اکتسابات کی آزمائش کے بجائے تعلیمی اداروں کی رسمی کاروائی بنتا چلا جارہا ہے بلکہ بن چکا ہے۔ جس قوم کے افراد کو صحیح معنی میں تعلیم یافتہ ہنرمند، متمدن، اور مہذب بننے سے انکار ہے ان کے یہاں امتحان کا رسمی کاروائی میں تبدیل ہوجانا ناگزیر بھی ہے۔

۲۴ جولائی ۱۹۵۸ء

بیٹھے بٹھائے

ایک شاعر نے شاید اپنے محبوبہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا ؎

تم کہ بیٹھے بٹھائے آفت ہو
اٹھ کھڑے ہو تو کیا قیامت ہو

غالباً شاعر کا تجربہ محدود اور مشاہدہ محدود تر تھا۔ ورنہ وہ قیامت کے برپا ہونے کو محبوب کے اٹھ کھڑے ہونے پر منحصر نہ سمجھتا۔ واقعہ یہ ہے کہ بیٹھے بٹھائے نہ صرف آدمی پر کوئی آفت آجاتی ہے بلکہ دنیا میں قیامت بھی اٹھ کھڑی ہوتی ہے۔ اور مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ ازل سے لے کر آج تک خدا کی کائنات اور از آدم تا ایں دم انسانوں کی دنیا میں جو کچھ ہوتا رہا ہے وہ بڑی حد تک بیٹھے بٹھائے ہوتا رہا ہے۔ بیٹھے بٹھائے قدرت نے بڑے

بڑے ہنگامے پیدا کئے اور انسان نے عجیب و غریب کارنامے کر دکھائے۔ البتہ جو لوگ نہ کارنامے انجام دے سکے اور نہ ہنگامے پیدا کر سکے انھوں نے اولاد پیدا کرنے پر اکتفا کر لی۔

ایک دن بیٹھے بٹھائے میرے ایک دوست کو خیال آیا کہ آج سے داڑھی رکھنی چاہیے اور ایک دوست کو یہ سوجھی کہ برسوں کی رکھی رکھائی داڑھی کو منڈا دینا چاہیے۔ جب سے میں پاکستان آیا ہوں یا یوں سمجھئے کہ جب سے پاکستان وجود میں آیا ہے میں نے بہت سے لوگوں کو ان دو متضاد خیالوں کا شکار دیکھا ہے۔ اور اسی بنا پر یہ بات میری سمجھ میں نہیں آتی کہ اگر کبھی "داڑھی اگاؤ" اور "داڑھی منڈاؤ" کے مسئلے پر دنیا کے سارے ممالک کے ووٹ لیے گئے تو پاکستان کا ووٹ کس طرف جائے گا کیونکہ یہاں نہ صرف "داڑھی اگاؤ" اور "داڑھی منڈاؤ" کی متضاد تحریکیں پہلو بہ پہلو چل رہی ہیں بلکہ بعض اوقات ایک ہی شخص باری باری سے دونوں تحریکوں کا ساتھ دیتا نظر آتا ہے۔ خیر اس مسئلے کو چھوڑیئے۔ میرے جن دوست نے داڑھی منڈا دی ان سے ایک روز میں نے پوچھا "اے حضرت آپ کی داڑھی کیا ہوئی؟" بولے "بیگم کی نذر ہو گئی" میں نے کہا "کیا مطلب؟" فرمایا۔ "بیگم مصر تھیں کہ داڑھی منڈا دو اور آپ جانتے ہی ہیں کہ ۔۔۔

اکبر دبے نہیں کسی سلطاں کی فوج سے
لیکن شہید ہو گئے بیگم کی نوج سے

چنانچہ یہی میری داڑھی شہید ہو گئی۔ میں نے کہا "آپ کی بیگم تو بہت مذہبی واقع ہوئی ہیں۔ پھر داڑھی کے خلاف ان کا جہاد کیا معنی؟" کہنے لگے "ہاں یہ صحیح ہے کہ وہ بہت مذہبی واقع ہوئی ہیں۔ مگر داڑھی وہ چیز ہے جسے عورت کی مذہبیت بھی برداشت نہیں کر پاتی۔" یہ جواب سن کر میں نے اپنے دل میں کہا کاش مرد اور مذاہب عورت کی اس نفسیات کا احترام کر سکتے۔

میرے دوسرے دوست جن کے رخسار مبارک رفتہ رفتہ داڑھیوں میں تبدیل ہو رہے تھے۔ ان سے ایک دن میں نے کہا۔ اگر جان کی امان پاؤں تو ایک بات پوچھوں۔" فرمایا پوچھو۔ میں نے کہا۔ حضور پر نور کے دل میں یہ خیال کیوں آیا کہ روئے مبارک کو خوبصورت بنانے کے لئے داڑھی رکھنے سے بہتر اور کوئی ترکیب نہیں۔ کہنے لگے۔ تم بدتمیزی کر رہے ہو۔ اگرچہ میں نے داڑھی چہرے کو خوبصورت بنانے کے لئے نہیں رکھی۔ لیکن تمہاری اطلاع کے لیے عرض کر دوں کہ خدا کو داڑھی والے چہرے حسین نظر آتے ہیں۔ پھر بڑی بات یہ ہے کہ داڑھی ہر مسلمان کو رکھنی چاہیے۔ میں نے کہا۔ ہاں مجھے خدا کا جمالیاتی فلسفہ تو معلوم ہے لیکن سوال یہ ہے کہ خود آپ کو آئینے میں اپنی صورت کیسی معلوم ہوتی ہے۔ کہنے لگے۔ میں نے خوبصورتی کے خیال سے تو داڑھی رکھی نہیں۔ داڑھی رکھنا سنت ہے۔ اور میری

داڑھی اس سنت کی ادائیگی ہے۔ میں نے کہا سنت سے زیادہ اہم شے فرض ہے اور فرائض میں سب سے زیادہ اہم نماز ہے۔ کہنے لگے۔ تائید ایزدی ہو گی تو نماز بھی شروع کر دوں گا۔

یہ جواب سن کر خیال آیا کہ مسلمان وہ قوم ہے جو داڑھی کو نماز پر یا دوسرے لفظوں میں سنت کو فرض پر ترجیح دیتی ہے۔ لیکن غور و فکر نے بتایا کہ سنت کو فرض پر ترجیح دینا صرف مسلمان کی فطرت نہیں۔ دراصل یہ انسان کی فطرت ہے۔ جو کام انسان کے لئے جتنا زیادہ ضروری قرار دیا جائے گا وہ اس سے اتنا ہی کترائے گا اسے جس سمت کے سفر سے جتنا زیادہ روکا جائے گا وہ اس سمت کے سفر پر اتنا ہی مصر ہو گا۔ یہی وجہ ہے کہ انسان کو احتراز سے زیادہ ارتکاب میں، ثواب سے زیادہ گناہ میں، حلال سے زیادہ حرام میں اور منکوحہ سے زیادہ محبوبہ میں کشش محسوس ہوتی رہی ہے۔

۱۲ر دسمبر ۱۹۵۷ء

حمیدیہ اسکول آوف اردو پوئٹری

اردو شاعری کے دلّی اسکول اور لکھنؤ اسکول سے کون اردو داں واقف نہیں۔ ان دو دبستانوں کے بعد اردو شعر و ادب کے جو اسکول وجود میں آئے ان سے بھی اگر ہر اردو داں نہیں تو کم از کم اردو ادب کے سنجیدہ طلبہ ضرور واقف ہیں۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ حمیدیہ اسکول آوف اردو پوئٹری سے وہ لوگ بھی واقف نہ ہوں گے جو اردو ادب کے تازہ سے تازہ میلان اور نئی سے نئی تحریک پر نظر رکھنے کا دعویٰ رکھتے ہیں۔ لیکن اس ناواقفیت کی وجہ سے ان کی ہمہ دانی پر کوئی حرف نہیں آتا اور اس نئے دبستان سے بے خبر رہنے میں ان کا کوئی قصور بھی نہیں۔ یہ نیا دبستان اس قدر گوشہ نشیں اور گمنامی پسند واقع ہوا ہے کہ اگر آئندہ دس برس تک بھی اردو ادب سے دلچسپی رکھنے والوں کو اس کے وجود کا علم نہ ہو سکے تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔

حمیدیہ اسکول اور اردو شاعری کے دوسرے اسکولوں میں ایک بڑا فرق یہ ہے کہ دوسرے اسکولوں کے نام اس شہر سے تعلق رکھتے ہیں جہاں وہ معرضِ وجود میں آئے۔

مثلاً دلّی اسکول دلّی سے منسوب ہے اور لکھنؤ اسکول لکھنؤ سے۔ لیکن حمیدیہ اسکول اپنے نام کے لئے کسی شہر کا رہین منت نہیں بلکہ اس ریستوراں کا رہین منت ہے جس کے حصار میں اس نے گوشہ نشینی اختیار کر رکھی ہے۔ ایسا کیوں ہوا اس کی اصل وجہ تو مجھے معلوم نہیں۔ البتہ ظاہری سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ چونکہ اس اسکول کے اراکین اس بات کے قائل ہیں کہ ادب کا زندگی سے بڑا گہرا تعلق ہے اور زندگی کا کھانے پینے سے اسی لئے انھوں نے اس نئے دبستان کی بنیاد رکھنے کے لئے حمیدیہ ریستوراں ہی کو سب سے مناسب جگہ سمجھا۔

لیکن راویوں کی روایت یہ ہے کہ حمیدیہ اسکول والے کھانے پینے کی چیزوں سے اس قدر قریب رہنے یا قریب بیٹھنے کے باوجود کھاتے کم اور پیتے زیادہ ہیں۔ پینے میں بھی وہ چائے کم پیتے ہیں اور پانی زیادہ۔ ہوتا یہ ہے کہ جب اس اسکول کے تمام اراکین معمول کے مطابق ایک مقررہ وقت پر جمع ہوتے ہیں تو پہلے وہ کافی دیر تک خاموش بیٹھے رہتے ہیں غالباً پطرس کے اس نظریئے کے مطابق کہ "جب دوستی پرانی ہو جائے تو گفتگو کی چنداں ضرورت باقی نہیں رہتی اور دوست ایک دوسرے کی خاموشی سے بھی لطف اندوز ہو سکتے ہیں"۔ اس کے بعد ان میں سے کوئی صاحب اخبار اٹھا کے خبریں پڑھنا شروع کر دیتے ہیں۔ جب وہ خبریں پڑھ چکتے ہیں تو دوسرے صاحب ان سے اخبار لے کر اشتہارات پڑھنے لگتے ہیں۔ اس طرح جب اخبار کا پڑھنا ختم ہو جاتا ہے تو ایک صاحب بیرے کو بلا کر پانی لانے کا حکم دیتے ہیں۔ جب وہ پانی پینے لگتے ہیں تو ان

کی دیکھا دیکھی باقی لوگوں کو بھی پیاس لگ جاتی ہے۔ بیرا ہر ایک کے لئے پانی فراہم کرتا ہے۔ پانی پینے کے بعد لوگ ایک دوسرے کو اپنی اپنی تازہ غزلیں بلاتے ہیں یا کسی فرسودہ لطیفے کو دہراتے ہیں۔ آخر میں ایک ایک پیالی چائے پی کر اپنے اپنے گھر کی راہ لیتے ہیں۔

اس نئے دبستان کے اراکین کی ایک دلچسپ خصوصیت یہ ہے کہ وہ لوگ اردو ادب کے دوسرے اداروں اور اسکولوں سے کسی قسم کا تعلق نہیں رکھتے۔ غالب تعلقات کے معاملے میں اس پر کبھی راضی ہو گئے تھے کہ حا کچھ نہیں تو عداوت ہی سہی۔ لیکن حمیدیہ اسکول والے کسی سے عداوت تک رکھنے کو تیار نہیں۔ چنانچہ یہ لوگ شہر کی تمام اچھی اور سنجیدہ ادبی سرگرمیوں سے الگ رہا کرتے ہیں۔ وہ نہ کسی جلسے میں جاتے ہیں نہ کسی مباحثے میں حصہ لیتے ہیں نہ کسی مشاعرے میں شریک ہوتے ہیں۔ لیکن اگر انہیں جلسوں، مباحثوں اور مشاعروں میں شرکت کی دعوت نہ دی جائے تو اس پر واویلا ضرور مچاتے ہیں۔ اور اپنے نالۂ وفریاد سے جلسوں، مباحثوں اور مشاعروں کے منتظمین کا ناطقہ بند کر دیتے ہیں۔ اب تو یہ سمجھنا مشکل ہو گیا ہے کہ یہ لوگ شہر کے سنجیدہ جلسوں اور مشاعروں میں شریک نہ ہونے کی وجہ سے مدعو نہیں کئے جاتے یا مدعو نہ ہونے کی وجہ سے شریک نہیں ہوتے۔

حمیدیہ اسکول والے شعر و ادب پر گفتگو کم کرتے ہیں۔ ان کے درمیان شاعروں اور ادیبوں کا ذکر (ذکر بد؟) زیادہ رہا کرتا ہے۔ شاید اس لئے کہ شعر و ادب پر گفتگو کے لئے مطالعے کی ضرورت ہوتی ہے اور شاعروں اور ادیبوں کے ذکر خیر کے لئے سنی سنائی کافی

ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ حمید یہ اسکول والے مطالعہ بالکل نہیں کرتے۔ دراصل یہ لوگ لکھتے زیادہ ہیں۔ پڑھتے کم ہیں اور سوچتے بالکل نہیں۔

حمیدیہ اسکول والے بڑے انسان پرست واقع ہوئے ہیں۔ لیکن ان کے نزدیک انسان کے معنی صرف مزدوروں اور کسانوں کے ہیں۔ اس اسکول کے اراکین میں سے کوئی بھی مزدوروں اور کسانوں کے طبقے سے تعلق نہیں رکھتا۔ اس لحاظ سے پتا نہیں وہ اپنے آپ کو انسان سمجھتے ہیں یا نہیں۔ بہرحال وہ صحیح معنوں میں انسان ہوں یا نہ ہوں انسان کی سی شکل و صورت ضرور رکھتے ہیں اور ہمیشہ کی طرح آج بھی ظاہر باطن سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔

حمیدیہ اسکول کے بعض اراکین شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ نقاد بھی واقع ہوئے ہیں۔ ان میں جو نقاد ہیں وہ نظریاتی تنقید بھی لکھتے ہیں اور عملی تنقید بھی۔ نظریاتی تنقید میں ان کا محبوب ترین موضوع یہ رہا ہے کہ ادب کو مریضانہ احساسات یعنی انفرادی احساسات کی بجائے اجتماعی زندگی کا آئینہ دار ہونا چاہئے۔ ان کے مضامین میں اس خیال کی تکرار دیکھ کر خیال ہوتا ہے کہ یا تو ابھی تک اردو قارئین اس نادر نکتے کو سمجھنے سے قاصر رہے ہیں یا کوئی اور بات خود ان نقادوں کی سمجھ میں نہیں آتی۔ جہاں تک عملی تنقید کا تعلق ہے یہ نقاد شعر و ادب کے حقوق سے زیادہ اپنے محسنوں اور دوستوں کے حقوق کا لحاظ رکھتے ہیں اور اپنے ان محسنوں اور دوستوں کو بھی مشاہیر ادب میں شمار کرنے سے دریغ نہیں کرتے جنھوں نے ابھی تک لکھنے پڑھنے کا کام شروع بھی نہیں کیا۔ ناقدانہ

جرات، بصیرت اور انصاف کی اس سے بہتر مثال شاید ہی کسی اور دبستان کے اہل قلم میں پائی جاتی ہو۔

فی الحال یہ پتا نا ممکن نہیں کہ حمیدیہ اسکول کے اراکین میں میر کارواں کون ہے۔ ویسے بظاہر اس اسکول کی امامت اور قیادت دو ایک پروفیسر صاحبان کے ذمے نظر آتی ہے۔ ان میں سے ایک صاحب نسبتاً اونچے درجے کے پروفیسر ہیں اور دوسرے نسبتاً کمتر درجے کے۔ ان دونوں کا فرق ان کے ذہن سے ظاہر ہو یا نہ ہو جسم سے یقیناً ظاہر ہے۔ بڑے پروفیسر صاحب اتنے ہی دبلے پتلے ہیں جتنے چھوٹے پروفیسر صاحب موٹے تازے۔ عینک دونوں لگاتے ہیں کیونکہ بصارت دونوں کی کمزور ہے اور بصیرت دونوں کی مشتبہ۔ دونوں اپنے آپ کو ایک دوسرے سے برتر سمجھتے ہیں۔ یہ اللہ جانتا ہے کہ ان دونوں میں کمتر کون ہے۔ دونوں کی ہر جنبش قلم بزعم خود ادب میں دلیل راہ اور سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے یہ اور بات ہے کہ قارئین کو ان کی تحریروں میں سنگ وخشت تو نظر آتے ہیں سنگ میل کہیں نظر نہیں آتا۔

یوں تو حمیدیہ اسکول والے دنیا اور دنیا کے ہنگاموں سے الگ تھلگ رہا کرتے ہیں لیکن شہر میں جب کوئی مشہور ادیب یا شاعر آتا ہے خصوصاً ایسا ادیب یا شاعر جس سے ان لوگوں کی نظریاتی رشتہ داری ہوتی ہے تو یہ لوگ اس کی طرف اسی عقیدت اور محبت سے لپکتے ہیں جس کا اظہار مذہبی مرید اپنے پیر صاحب کے ورود مسعود پر کیا کرتے ہیں چنانچہ ایک مرتبہ جب دور حاضر کے مشہور ادیب ۔ ۔ ۔ ۔ آنے والے تھے تو ایک پچھلے

نے حمیدیہ اسکول کے ایک ممتاز رکن سے پوچھا تھا کہ آپ لوگوں کے پیر صاحب آ رہے ہیں۔ آپ ان کے استقبال کے لئے ائرپورٹ جائیں گے کہ نہیں۔ ادب سے تعلق رکھنے کے باوجود وہ اس تشبیہ کی داد دینے کی بجائے اس پر ناراض ہو گئے تھے۔ خیر تو کہنے کی بات یہ تھی کہ کسی بڑے ادیب یا شاعر کے آنے پہ ان لوگوں میں محبت اور اس کے ساتھ رقابت دونوں کے جذبات بیدار ہو جاتے ہیں۔ ہر ایک کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ ہمیں اس ادیب یا شاعر کی توجہ کا مرکز بن جائیں۔ اس کوشش میں بعض اوقات یہ لوگ ایک دوسرے کو اس ادیب یا شاعر کی نظر سے گرانے کی ہر ممکنہ ترکیب پر عمل کر گذرتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہر مشہور و ممتاز ادیب کے آنے پہ ان لوگوں کے باہمی تعلقات کی دیوار میں شگاف پڑ جاتے ہیں جن کی مرمت بعد میں ہوتی رہتی ہے۔

آپ کہیں گے کہ میں نے حمیدیہ اسکول والوں اور دبستان کے بارے میں اتنی اطلاعات بہم پہونچا دیں لیکن ابھی تک یہ نہیں بتایا کہ اردو شاعری کا یہ نیا دبستان پاکستان کے کس شہر یا کس ویرانے میں ہے۔ تو صاحب میں یہ بات بتانے سے قطعاً معذور ہوں کیونکہ شروع ہی میں عرض کر چکا ہوں کہ حمیدیہ اسکول والے گوشہ نشین اور گمنامی پسند واقع ہوئے ہیں۔ ایسی صورت میں ان کا پتہ ٹھکانا بتا کر ان کی گوشہ نشینی اور گمنامی میں خلل انداز ہونا ایک اخلاقی جرم کا مرتکب ہونے سے کم نہیں۔ لہٰذا بہتر یہی ہے کہ انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیا جائے اور ان کے بارے میں زیادہ کرید نہ کی جائے۔

۳۰ اکتوبر ۱۹۵۸ء

آزادی اور شرافت

میرے متعلق میرے دوست امجد کا خیال ہے کہ میں قابل اعتماد آدمی ہوں اور یہ بات میری صورت سے اُسی طرح ٹپکتی ہے جس طرح غالب کے درو دیوار سے ان کا بیابان ہونا ٹپکتا تھا۔ معلوم نہیں امجد کا یہ خیال کس حد تک صحیح ہے لیکن اتنا ضرور ہے کہ میں بہت سے دوستوں کا رازدار رہا ہوں۔ غالباً یہ کہنا بھی غلط نہ ہوگا کہ میں اپنے بعض دوستوں کا دوست اتنا نہیں جتنا ان کا رازدار ہوں۔ آپ کو شاید یقین نہ آئے مگر واقعہ یہ ہے کہ کسی کا راز دار بننے میں میری کوششوں کو ذرا بھی دخل نہیں ہوتا۔ بعض اوقات تعلقات کو بھی دخل نہیں ہوتا بعض لوگ دوسری ہی ملاقات میں اپنے دل کا بوجھ میرے سینے میں اتار پھینکتے ہیں۔ امجد نے ایسا ہی کیا تھا۔ وہ دوسری ہی ملاقات میں مجھ سے نہ صرف بے تکلف ہوگیا تھا بلکہ اس نے مجھے اپنا معتمد علیہ بھی بنا لیا تھا۔ میری اس کی گفتگو جب مختلف

موضوعات سے گزرتی ہوئی حسن و محبت تک پہنچی تو باتوں باتوں میں اُس نے مجھے اپنے دو ایک معاشقوں کی روداد سنا ڈالی۔

بعض احباب اپنے معاشقے کی داستان سناتے وقت یا تو رہ رہ کر مجھے تاکید کرتے ہیں کہ دیکھو کسی سے کہنا نہیں یا پھر داستان سنانے کے بعد مجھ سے مشورہ چاہتے ہیں کہ اب کیا کریں۔ امجد نے نہ تو مجھے اس قسم کی تاکید کی نہ مجھ سے کوئی مشورہ طلب کیا۔ میرا خیال ہے کہ کسی کو راز دار بنانے کے مختلف محرکات ہوا کرتے ہیں۔ امجد نے مجھے اپنا راز دار اس لئے نہیں بنایا تھا کہ وہ اپنا دل ہلکا کر سکے یا اپنے عشق کی گتھیوں کو سلجھانے میں مجھ سے مدد لے۔ دراصل اس کو یہ بتانے میں ایک خاص قسم کی مسرت اور لذت محسوس ہوتی تھی کہ وہ کتنی حسین نگاہوں کا مرکز اور کتنی حسیناؤں کا محبوب رہ چکا ہے۔ اس کی ہر داستان میں اس کی حیثیت عاشق سے زیادہ محبوب کی ہوا کرتی تھی۔ شاید یہی وجہ تھی کہ وہ اپنی آہوں اور اپنے آنسوؤں کا ذکر نہیں کرتا تھا۔ اس کی داستان میں اگر آہیں اور آنسو ہوتے بھی تھے تو وہ ان لڑکیوں کے ہوتے جو ان پر جان چھڑکتی تھیں۔ اس کے ہر معاشقے میں پہل لڑکی ہی کی طرف سے ہوتی تھی۔ اپنی شخصیت کی اس بے پناہ کشش کے باعث بعض اوقات وہ اپنے آپ کو تکلیف دہ صورت حال میں گرفتار پاتا۔ مثلاً جب اس کے ایک بہت ہی عزیز دوست کی بہن اس پر فریفتہ ہو گئی تو وہ ایک اخلاقی کشمکش میں مبتلا ہو گیا۔ اس

کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ آیا وہ اپنے دوست کے ساتھ ناز یبا سلوک کر رہا ہے یا اس کی بہن کے ساتھ۔ لیکن چونکہ چاہنا اور چاہا جانا ایسی سستی لذت نہیں جو اخلاقی کشمکش سے بچنے کے لئے قربان کر دی جائے اس لئے امجد نے اپنے ضمیر کی ملامتوں کے باوجود اپنے دوست کی بہن سے محبت کے سلسلے کو منقطع نہ ہونے دیا۔ اس کے دوست کے یہاں سخت پردے کا رواج تھا۔ اس کے گھر کی ساری مستورات امجد سے بھی پردہ کرتی تھیں۔ پھر بھی امجد کی محبوبہ اس سے ملنے کا موقع نکال لیتی تھی۔ امجد اپنے دوست سے ملنے کے لئے اس کے گھر ایسے وقت پہنچتا جب اس کا گھر پر نہ ہونا یقینی ہوتا۔ اس وقت اس کی بہن چپکے سے باہر والے کمرے میں آکر امجد سے مل لیتی۔ دونوں میں راز و نیاز کی باتیں ہو جاتیں۔ بوس و کنار تک ہو جاتا۔ ان لمحات میں دونوں اپنا اپنا محبت نامہ ایک دوسرے کے حوالے کر دیتے۔

امجد کے ساتھ مصیبت صرف یہ نہ تھی کہ اس پر لڑکیاں فریفتہ ہوتی رہتی تھیں۔ بعض اوقات وہ اپنے بعض احباب کی بیویوں کو بھی اپنی طرف ملتفت پاتا۔ حمید کی بیوی کے بارے میں تو اسے پورا یقین تھا کہ وہ نئی نویلی دلہن ہونے کے باوجود اس سے گہری دلچسپی رکھتی تھی۔ بعض اوقات امجد یہ بھی محسوس کرتا کہ حمید نے اس کی ذات میں اپنے رقیب کو دیکھ لیا ہے اور اس بنا پر اپنی بیوی کو اس کے سامنے بلانے سے احتراز کرنے لگا ہے۔ حمید اگر

امجد کی طرف سے کسی قدر محتاط ہو گیا تھا تو اس میں کوئی برائی نہ تھی بلکہ وہ محتاط ہونے میں بالکل حق بجانب تھا۔ پھر بھی ایک دن امجد پر یہ بات بہت گراں گزری کہ جب وہ حمید سے ملنے گیا تو اسے اندر بلانے کی بجائے حمید خود باہر آکر اس سے ملا اور اپنی بیوی کے بارے میں اس نے کہہ دیا کہ ان کی طبیعت ٹھیک نہیں اس لئے وہ سوئی ہوئی ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ یہ بات جھوٹ تھی۔ امجد کی عقابی آنکھوں نے ادھ کھلی کھڑکی سے دیکھ لیا تھا کہ حمید کی بیوی بستر پر لیٹی ناول پڑھ رہی تھی۔

جب امجد مجھ سے اس قسم کے واقعات بیان کرتا تو اس بات پر اظہارِ افسوس ضرور کرتا کہ ہمارے ملک میں محبت کس درجہ مجبور ہے۔ وہ اپنے مزاج اور طرزِ معاشرت میں مشرقی ہونے کے باوجود مغربی معاشرے کا صرف اس لئے مداح بن گیا تھا کہ اس معاشرے میں دل و نگاہ آزاد ہیں۔ محبت آزاد ہے۔ اسے اپنی زندگی میں اگر کسی بات کا رونا تھا تو صرف اس کا کہ اس ملک میں محبت کے آزاد نہ ہونے کے باعث وہ کتنی جسمانی قربتوں اور شہوانی لذتوں سے محروم رہ گیا ہے۔ کبھی کبھی از رہِ مذاق وہ یہاں تک کہہ جاتا کہ انسان کے لئے جنسی آزادی سیاسی آزادی سے زیادہ ضروری ہے کاش ہم برطانیہ کے غلام ہوتے لیکن محبت کے معاملات میں آزاد ہوتے۔

امجد نے اپنی زندگی میں اگر کوئی نعرہ لگایا ہے تو وہ صرف محبت

کے معاملات میں آزادی کا نعرہ ہے چونکہ وہ افسانہ نگار اور شاعر بھی ہے اس لئے اس نے اپنے کئی افسانوں اور نظموں میں بھی سماج سے۔ اس آزادی کا مطالبہ کیا ہے۔ لیکن ادھر دو مہینے سے میں اس کی فطرت میں ایک عجیب تبدیلی دیکھ رہا ہوں ــــ وہ تبدیلی جسے اس کی زندگی کا سب سے بڑا انقلاب کہنا چاہیئے ــــ یہ انقلاب اس کی شادی کا نتیجہ ہو یا نہ ہو لیکن اتنا ضرور ہے کہ یہ انقلاب اس کی شادی کے بعد رونما ہوا ہے۔ شادی سے چند روز پہلے اس نے مجھ سے کہا تھا کہ اگرچہ اس کے یہاں پردے کا رواج سخت ہے پھر بھی وہ اپنی بیوی کو اپنے مخصوص اور مخلص دوستوں سے پردہ نہیں کرنے دے گا۔ چونکہ ایسے دوستوں کی فہرست میں میرا نام بھی تھا اس لئے شادی کے بعد ایک دن وہ اپنی بیوی کے ساتھ مجھ سے ملنے آ گیا۔ اس معاملے میں اس نے میری طرف سے کسی دعوت کا بھی انتظار نہیں کیا۔ میں اس کے اس اخلاص و اعتماد سے بہت متاثر ہوا۔ لیکن اس ملاقات کے بعد نہ جانے کن مصلحتوں کی بنا پر وہ اپنی بیوی کے معاملے میں میری طرف سے بھی احتیاط برتنے لگا ہے۔ چنانچہ میں اس کے گھر پر جاتا ہوں تو اس کی بیوی میرے سامنے نہیں ہوتی۔ پھر بھی جیسا کہ امجد کی گفتگو سے اندازہ ہوا میاں بیوی دونوں میری شرافت کے بہت قائل ہیں۔ اتنے ہی قائل جتنے بعض دوستوں کی شرافت کے شاکی۔ امجد کو وہ ایک دوستوں

کی یہ بات بہت ناگوار گزرتی ہے کہ جب وہ اس کے گھر پہ اس سے ملنے آتے ہیں تو کھڑکیوں یا ادھ کھلے دروازوں سے اس کی بیوی کو دیکھ لینے کی کوشش ضرور کرتے ہیں۔ امجد آئے دن مجھ سے ایسے دوستوں کے حسن نیت کا رونا روتا رہتا ہے۔ اب وہ اپنے معاشرے میں دل و نگاہ کی آزادی کے متعلق کچھ نہیں کہتا۔ اب وہ لوگوں میں شرافت نفس کی کمی پر کڑھتا رہتا ہے! امجد کی اس ذہنی تبدیلی نے مجھے یہ سوچنے پر مجبور کر دیا ہے کہ کیا آزادی کے معنی صرف اپنی آزادی اور شرافت کے معنی صرف دوسروں کی شرافت کے ہیں۔ اگر زحمت نہ ہو تو اس سوال پہ آپ بھی غور فرمائیں۔

۱۴ر مارچ ۵۹ء

مستقبل کا ادیب

میں ایک ادیب ہوں۔ مستقبل کا ادیب۔ آپ کہیں گے کیا بے تکی بات ہے۔ مستقبل کا ادیب تو مستقبل میں پیدا ہو گا۔ تم مستقبل کے ادیب کیونکہ ہو۔ تو صاحب میرا مطلب یہ ہے کہ لکھنا تو میں نے ابھی سے شروع کر رکھا ہے لیکن ابھی میرا شمار ادیبوں میں نہیں ہوتا۔ ادیبوں میں میرا شمار مستقبل میں ہو گا جب میری شہرت چار دانگ عالم میں پھیل جائے گی۔ جب میں کئی مطبوعہ کتابوں کا مصنف اور کئی نوخیز نقادوں کے مضامین کا موضوع بن چکوں گا۔ نقادوں کے لئے "نوخیز" کی صفت اس لئے استعمال کر رہا ہوں کہ میں جس زبان میں لکھتا ہوں یعنی جس زبان کا ادیب بننے والا ہوں اُس میں اعلیٰ

رہے نقاد کسی ادیب یا شاعر پر کتاب کا تو ذکر ہی کیا ہے مفصل مضمون بھی شاذ و نادر لکھتے ہیں۔ ان کا پیشہ ادیبوں اور شاعروں پر مضمون لکھنے سے زیادہ ان کی کتابوں کا مقدمہ لکھنا رہ گیا ہے۔ البتہ نو خیز نقاد مشق سخن یا مشق ستم کے طور پر اس کمی کو پورا کرتے رہتے ہیں۔ ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ میرا ادیب ہونا مستقبل میں تسلیم کیا جائے گا۔ جب میں نہ صرف لکھنے کے بہت سے نشیب و فراز سے گزر چکوں گا بلکہ چھپنے چھپانے کے معاملے میں ہر قسم کے پاپڑ بیل چکوں گا۔

آپ کہیں گے پاپڑ بیلنے سے ادیب کا کیا تعلق؟ اب میں کیا بتاؤں کہ مستقبل کے ادیب کا پاپڑ بیلنے سے کتنا گہرا تعلق ہے اور اسے کیسے کیسے پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں۔ اول تو مجھے جس ملک کا باشندہ ہونے کا فخر حاصل ہے وہاں ادیب بننے کا حوصلہ ہی حماقت سے کم نہیں اور حماقت بھی ایسی کہ جس کی سزا زندگی بھر بھگتنا پڑتی ہے، خواہ آدمی ادیب بن سکے یا نہیں۔ ادیب بننے کا حوصلہ رکھنے والے سے اُس کے والدین مایوس ہو جاتے ہیں۔ اُسکی بیوی اور سسرال والے اسے جیتے جی صبر کر لیتے ہیں۔ اُس کی اولاد اپنے آپ کو یتیم سمجھنے لگتی ہے۔ معاشرے کے افراد اسے عضو معطل کی حیثیت سے دیکھتے ہیں اپنے بیگانے اسے نالائق سمجھتے ہیں اور حکومت اسے نالائق رعتنا تصور کرتی کرتی ہے نہ صرف ادبی زندگی کے آغاز میں بلکہ آخر دم تک۔

یہاں قدرتی اور منطقی طور پر آپ یہ جاننا چاہیں گے کہ جس ملک و معاشرے میں ادیب کی یہ قدر و قیمت ہو وہاں ادیب بننا کیا ضرور۔ اس سوال پر میں نے بھی اس نقطۂ نظر سے غور کیا ہے کہ جس ملک و معاشرے میں رشوت ستانی، منافع خوری، چور بازاری، ذخیرہ اندوزی، اسمگلنگ اور اسی قبیل کے دوسرے کام مفید ثابت ہوئے ہوں اور مقبول بھی۔ اس حد تک مقبول کہ وزرائے کابینہ تک نے ان کاموں کو اپنا محبوب مشغلہ بنا لیا تھا وہاں ادیب بننے کی ہوس یا حماقت کیا معنی۔ میں نے اپنے آپ کو اس بات پر آمادہ کرنے کی بڑی کوشش کی کہ عزت اور عافیت حاصل کرنے کی جو ترکیبیں آج کل نہایت کارگر سمجھی جاتی ہیں ان سے کام لے کر میں بھی اپنی قوم کا محترم فرد اور اپنے معاشرے کا معزز رکن بن جاؤں۔ زندگی آرام سے گزاروں۔ عاقبت کی فکر عاقبت اندیشوں کے لئے چھوڑ دوں۔ جب تک زندہ رہوں گھر والے میری زندگی سے بیزار نہ ہوں اور جب مر جاؤں تو میرے ورثا کو اتنی وراثت ہاتھ آجائے کہ میرے مرنے کا غم آسانی سے غلط ہو جائے۔ یہ خیالات اور خواہشیں میرے دل میں بھی یہاں قدمی کے لئے آتی رہتی ہیں۔ لیکن کیا کروں۔ اپنی افتاد طبیعت سے مجبور ہوں۔ لکھنے پڑھنے کے سوا کسی اور کام کی طرف طبیعت مائل ہی نہیں ہوتی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میری افتاد طبیعت ہی میری تقدیر ہے۔ لوگ مجھے یکسر نا اہل سمجھتے ہیں۔ مجھ میں اور لوگوں

میں اتنا ہی فرق ہے کہ میں اپنے آپ کو ادبی کارگزاریوں کے علاوہ کسی اور کام کا اہل نہیں سمجھتا۔

لیکن اپنے متعلق یہ تھوڑی سی خوش گمانی بھی جس کے سہارے میں جی رہا ہوں آئے دن مدیران رسائل کے ہاتھوں مجروح ہوتی رہتی ہے۔ چونکہ میں بساط ادب کے نو واردوں میں سے ہوں اس لئے اچھے رسالوں کے ایڈیٹر میری اچھی سے اچھی کاوشوں کو ردی کی ٹوکری میں ڈال دیتے ہیں۔ میں اس سلوک کو بھی گوارا کر لیتا بشرطیکہ وہ مشہور لکھنے والوں کی گھٹیا تحریروں کو فخر کے ساتھ پیش نہ کرتے۔ برنارڈ شو نے ایک مشہور ایڈیٹر فرینک ہیرس کے بارے میں ایک جگہ لکھا ہے کہ اس میں دو بڑی خوبیاں تھیں۔ ایک تو یہ کہ اس میں اچھی اور بری تحریروں کو پہچاننے کی صلاحیت تھی۔ دوسری یہ کہ وہ بڑی تحریروں پر اچھی تحریروں کو ترجیح دیتا تھا۔ ممکن ہے ہماری زبان کے ایڈیٹر اچھی اور بری تحریروں کو پہچاننے کی صلاحیت رکھتے ہوں لیکن ان میں مشہور ادیبوں کی بری تحریروں پر غیر مشہور یا نیم معروف ادیبوں کی اچھی تحریروں کو ترجیح دینے کی صلاحیت یا ہمت یقیناً نہیں پائی جاتی۔ مشہور ادیبوں کی طرف سے انہیں جو کچھ مل جائے اُسے وہ شکریہ کے ساتھ رسالے میں نمایاں جگہ دیتے ہیں۔ ان کی اسی خصوصیت کی بدولت ایک مرتبہ میرا ایک مسترد مضمون ایک موقر جریدے میں شایع ہو گیا تھا۔ قصہ یہ ہوا کہ میں نے بڑی محنت سے

ایک مضمون لکھ کر پہلے پہل اس موقر جریدے کے ایڈیٹر کے پاس بھیجا۔ انہوں نے اس کی رسید تک نہیں دی۔ خیال آیا کہ جواب کے لئے ٹکٹ تو بھیجا نہیں تھا جواب کیونکر آئے۔ چنانچہ میں نے جوابی ٹکٹ بھی بھیج دیا۔ اس پر بھی ایڈیٹر صاحب کی مہر خاموشی نہ ٹوٹی۔ میں جواب کے لئے تقاضے پہ تقاضا کرتا رہا آخر بڑے انتظار کے بعد ایک دن ایک لفافہ موصول ہوا۔ دیکھا تو اس میں وہی مضمون تھا جو ان الفاظ کے ساتھ واپس کیا گیا تھا کہ "آپ کا مضمون اشاعت کے قابل نہیں ہے۔ تعاون کا شکریہ"

کچھ عرصہ کے بعد حسن اتفاق سے وہ جو مشہور افسانہ نگار ہیں ــــ نام بتانا کیا ضرور ــــ میں نے انہیں اپنا مضمون دکھایا۔ انہوں نے اس کی بڑی تعریف کی اور کہا کہ اسے کسی رسالے کو بھیج دیجئے۔ میں نے کہا۔ میں تو بھیج کر دیکھ چکا ہوں۔ اب آپ بھیج دیکھیں چنانچہ انہوں نے اُسے اسی رسالے کے پاس بھیج دیا جہاں سے وہ واپس آیا تھا۔ اُن کے نام ایڈیٹر کا جواب آیا کہ مضمون کا شکریہ۔ اگلے مہینے کے شمارے میں شائع ہو رہا ہے۔ صاحب مضمون سے کچھ اور مضمون بھیجوائیے۔

اس واقعے سے میں نے یہ نتیجہ نکالا کہ مضمون معیاری ہو یا نہ ہو لیکن اگر کسی بڑے ادیب کی وساطت سے کسی رسالے تک پہنچے تو وہ یقیناً معیاری ہو جاتا ہے۔ اب جی تو یہی چاہتا تھا کہ اپنے سارے مضامین ان ہی کے

ذریعہ سے رسالوں کو بھیجا کروں۔ لیکن بیچ میں سوال آ گیا اپنی خودی اور خودداری کا۔ اقبال سے متاثر ہونے کا نتیجہ یہی ہوتا ہے کہ آدمی کسی اور کے کندھے پر بندوق رکھ کر چھوڑنا گوارا نہیں کرتا۔ چنانچہ حسب معمول میں خود مضمون بھیجتا رہا جو کہیں چھپ جاتا اور کہیں سے واپس آ جاتا۔ جو واپس آ جاتا وہ اسی درجے کے دوسرے رسالے میں شائع ہو جاتا۔ چھپے ہوئے مضامین میں کاتبوں کی اصلاح کے علاوہ ایڈیٹر صاحبان کے حذف و اضافے بھی نظر آتے۔ یہ بات مجھے مضامین کے نہ چھپنے سے بھی زیادہ گراں گزرنے لگی۔ اس کے معنی یہ نہیں کہ میں اپنی خامیوں کی اصلاح پسند نہیں کرتا۔ در اصل بات یہ ہے کہ ایڈیٹروں کے حذف و اضافے قطعاً بیجا تھے۔ جب میں نے اُن سے حذف و اضافے کا سبب دریافت کیا تو انہوں نے رسالے کی پالیسی کی آڑ لی۔ جب میں نے اُن سے پوچھا کہ میری فلاں حذف شدہ عبارت نہ تو ادبی نقطۂ نظر سے غیر معیاری ہے، نہ مذہبی نقطۂ نظر سے دل آزار، اور نہ آئینی نقطۂ نظر سے قابل اعتراض، پھر آپ نے اسے کیوں حذف کر دیا تو وہ مجھے مطمئن کرنے کی بجائے خاموش ہو رہے۔

عام طور پہ دیکھنے میں یہ آیا کہ میری جن عبارتوں میں کسی ادیب یا شاعر کی کوتاہیوں کے متعلق کوئی بے لاگ رائے ہوتی وہ یا تو حذف کر دی جاتی یا اس پر کچھ لیپ پوت کر دی جاتی۔ اس پر میں نے ایڈیٹروں کے

سامنے تین شرطیں رکھیں۔ (۱) اگر آپ کو میری رایوں سے اختلاف ہو تو میری رایوں میں ترمیم کرنے کی بجائے حاشیے پہ اپنے اختلاف کا اظہار کر دیا کریں، کیونکہ آپ جو اپنے نقطۂ نظر کے مطابق میرے مضمون میں ترمیم و تنسیخ کرتے ہیں تو اس کی کیا ضمانت کہ آپ ہی کا نقطۂ نظر صحیح ہے اور میرا یقینی طور پہ غلط۔ علم و ادب کے معاملات میں صحیح اور غلط کا صحیح فیصلہ صدیوں میں ہوا کرتا ہے (۲) جی چاہے تو میرے مضمون کے جواب میں مستقل مضمون لکھ ڈالیں یا کسی سے لکھوا دیں مگر میری رایوں کو جوں کا توں رہنے دیں (۳) اگر یہ دونوں باتیں منظور نہ ہوں تو مضمون میں کاٹ چھانٹ کرنے کی بجائے اُسے واپس کر دیا کریں۔

بعض ایڈیٹروں نے میری کوئی بھی شرط منظور نہیں کی۔ بعض نے صرف تیسری شرط منظور کی۔ میں نے ان دونوں قسم کے ایڈیٹروں سے تعلقات منقطع کر لیے۔ لیکن تعلقات منقطع کرنے کے بعد بھی ایک ایڈیٹر صاحب نے اپنے رسالے کے ایک خاص نمبر کے لیے جو ایک مشہور ادیب کی یاد میں نکلنے والا تھا مجھے لکھنے کی دعوت دی اور زندہ ادیبوں پہ مرحوم ادیبوں کے حقوق جتلائے۔ چونکہ میرے دل میں اس مرحوم ادیب کی بڑی وقعت تھی اس لئے میں نے ایڈیٹر صاحب سے ترکِ تعلق کے باوجود لکھنے کی دعوت قبول کر لی۔ موضوع کے بارے میں ایڈیٹر صاحب سے پوچھ لیا کہ اگر فلاں پہلو پہ کوئی اور صاحب نہ

لکھ رہے ہوں تو میں لکھوں۔ انہوں نے کہا کہ ہاں لکھیئے۔ مضمون بھیجتے وقت
میں نے حسب معمول لکھ دیا کہ براہ کرم مضمون جوں کا توں شائع کریں
اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو اسے واپس بھیج دیں۔ ایڈیٹر صاحب نے مضمون
واپس بھیج دیا ان الفاظ کے ساتھ کہ آپ نے مضمون محنت سے لکھا ہے اس اقرار
کے باوجود اسے ہوبہو چھاپنا مشکل ہے۔ اگر آپ مجھے اجازت دیتے کہ جہاں
مجھے اختلاف ہوا کرے وہاں اپنی مرضی سے کچھ گھٹا بڑھا دیا کروں تو یہ مضمون بھی
واپس نہ ہوتا۔ اس کج ذہنی سے دل جل گیا اور جواب میں میں نے ایک خط لکھ مارا
جس میں منجملہ اور باتوں کے ان سے پوچھا کہ میرے مضمون میں آپ کے خیالات کا
ہونا کیا معنی اور جب آپ میرے مضمون میں میرے بعض خیالات کو گوارا نہیں
کر سکتے تو میں اپنے مضمون میں آپ کے خیالات کو کیوں گوارا کروں۔ پھر یہ کہ آپ
جس ادیب کی یاد میں نمبر شائع کر رہے ہیں وہ آزادیٔ خیال کے زبردست حامی
تھے اور آزادیٔ خیال کی روایت کو قائم رکھنے اور اسے تقویت پہنچانے کی بہترین
صورت یہ تھی کہ خود مرحوم پر اظہار خیال کرنے والوں کو آزادیٔ رائے کے حق
سے محروم نہ کیا جاتا۔ مگر عجیب بات ہے کہ آپ عقیدت تو رکھتے ہیں مرحوم
سے اور عمل کرتے ہیں ان لوگوں کے نقطۂ نظر پر جن کی وجہ سے مرحوم کی تحریروں
پر کئی مقدمے چلے ؎۔ ع

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

جب وہ نمبر شائع ہوا تو دیکھا کہ جس موضوع پر میں نے لکھا تھا اسی پر ایک مشہور ادیب کا مضمون اس پرچے میں موجود ہے۔ ان کا مضمون سراسر تحسینی تھا اور میرا تنقیدی تھا۔ میں نے مرحوم کی بہت سی خوبیوں کو اجاگر کرنے کے ساتھ ساتھ ان کی بعض خامیوں کی طرف بھی اشارے کئے تھے۔ اور یہ ایک اہم وجہ تھی میرے مضمون کے مسترد کئے جانے کی۔ جس طرح ہماری تنقید اپنے عہدِ طفولیت میں تعریف و تحسین کی مترادف تھی اسی طرح بڑی حد تک آج بھی تعریف و تحسین کی مترادف ہے۔ تخلیقی کام کرنے والے اپنی تخلیقات کے متعلق بے لاگ رائے کی تاب نہیں لاتے۔ نقّاد لوگ، دوستی یا مصلحت کی بنا پر بے لاگ رائے ظاہر نہیں کرتے۔ ایڈیٹر صاحبان بے لاگ رائے شائع نہیں ہونے دیتے۔ یہ ہے ادبی صورت حال۔ اس کا نتیجہ ظاہر اور انجام معلوم۔

خیر بات کہاں سے کہاں چلی گئی۔ میں ذکر کر رہا تھا مستقبل کے ادیب کی دشواریوں کا۔ عام طور پر ذریعۂ معاش کے معاملے میں ادیبوں کو اس سے زیادہ کی توفیق نہیں ہوتی کہ وہ یا تو کسی دفتر میں کلرک ہوتے ہیں یا کسی اسکول میں معلم یا کسی کالج میں لیکچرر۔ میں بھی ان مرحلوں سے گزر رہا ہوں۔ کلرک، اسکول ٹیچر یا لیکچرر کی تنخواہ کا علم اور آج کل کی مہنگائی کا تجربہ کسے نہیں۔ ایسے حالات میں آمدنی کے ضمنی ذرائع کی تلاش

نہ صرف قدرتی بات ہے بلکہ ناگزیر بھی۔ لیکن اگر مستقبل کا ادیب
یہ چاہے کہ وہ اپنی مستقل تنخواہ کے علاوہ اپنے قلم کی مدد سے مزید
آمدنی پیدا کرے تو اس یہاں بھی ایسے حوصلہ شکن دشواریوں کا سامنا
کرنا پڑتا ہے۔ رسائل و جرائد والے اگر اس کی ذہنی کاوشوں کو اشاعت
کے قابل سمجھتے بھی ہیں تو انھیں معاوضے کے قابل نہیں سمجھتے۔ ریڈیو کے
پروگراموں کے حقدار یا تو ممتاز مستند ادیب ہوتے ہیں یا پھر پروگرام
دینے والوں کے مخصوص احباب اور محبوب اعزہ۔ رہے ناشر سو وہ
بھی مستقبل کے ادیبوں کی کتابیں خریدنے کو تیار نہیں ہوتے خریدنا تو
ایک طرف وہ بلا معاوضہ بھی شائع کرنے پر آمادہ نہیں ہوتے بعض تو ایسے
بھی ہیں جو مستقبل کے ادیبوں سے ان کی کتابوں کی طباعت کے نصف
مصارف لے کر بھی کتابیں شائع نہیں کرتے بلکہ مسودات تک ہضم کر جاتے
ہیں۔ با ایں ہمہ یہ حقیقت ہے کہ مستقبل کے ادیبوں کے لیے رسالوں کے
ایڈیٹروں اور کتابوں کے ناشروں کی حیثیت سرپرست کی ہے۔ ٹھیک ویسے
سرپرست کی جیسا ڈاکٹر جانسن کو نصیب ہوا تھا۔

بہت سے خوش عقیدہ لوگ عزبت اور عسرت کی زندگی کو شعر و ادب
کا سرچشمہ تصور کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک ادیبوں کا تنگ دست اور
مفلوک الحال ہونا ہی ان کی تخلیقی صلاحیتوں کے حق میں بہتر ہے۔ اس

نقطۂ نظر کی تائید میں ڈکنس اور پریم چند کی مثالیں اکثر پیش کی جاتی ہیں۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ مالی آسائش اور آسودگی آدمی کو اس قابل نہیں رکھتی کہ وہ تخلیقی کاموں کی محنت اور زحمت برداشت کر سکے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ دونوں باتیں مغالطہ آمیز ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ ڈکنس اور پریم چند جس قسم کے ادیب بنے اس میں ان کی غربت اور عسرت کو بڑا دخل تھا لیکن اس سے یہ نتیجہ کیونکر اخذ کیا جا سکتا ہے کہ اچھے اور بڑے ادیب کی تخلیق کے لیے غربت اور عسرت لازمی شرط ہے۔ دنیا کے تمام بڑے ادیب ڈکنس اور پریم چند کی طرح مفلوک الحال گھرانوں میں نہیں پیدا ہوئے اس کے باوجود وہ لازوال ادب یقیناً پیدا کر گئے۔ جو لوگ غربت اور عسرت کو زندگی کے گہرے تجربات کے حصول کا ذریعہ سمجھتے ہیں ان کے لئے سوچنے کی بات یہ ہے کہ یورپ اور امریکا کے ادیب جو پاکستانی ادیبوں کے مقابلے میں غیر معمولی آرام و آسائش کی زندگی بسر کرتے ہیں انہیں زندگی کے گہرے تجربے کیونکر حاصل ہوتے ہیں۔ ان کی قابل رشک بصیرت کا راز کیا ہے اور ان کی اقتصادی خوشحالی ان کی تخلیقی سرگرمیوں میں کیوں مانع نہیں آتی۔

بات دراصل یہ ہے کہ جو لوگ قدرت کی طرف سے تخلیقی صلاحیتیں

لے کر آتے ہیں وہ چاہے غربت کی گود میں پیدا ہوئے ہوں یا امارت کے آغوش میں شعروادب کی تخلیق ان کے دل و دماغ کا بنیادی تقاضا ہوتی ہے۔ زندگی کے عرفان کے لئے وہ صرف ذاتی تجربے کے محتاج نہیں ہوتے۔ جو باتیں اُن کے تجربے میں نہیں آتیں وہ انہیں مشاہدے کے ذریعے سے معلوم ہو جاتی ہیں۔ وہ ساحل پہ کھڑے رہ کر جس حد تک طوفان کا اندازہ کر لیتے ہیں آتنا طوفان کی تہہ میں ہمیشہ کے لئے چلے جانے والے بھی نہیں کر پاتے۔ اُن کے حواس خمسہ عام آدمیوں کے حواس خمسہ سے زیادہ بیدار رہا کرتے ہیں اور مجھے تو کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جو شخص فطرتاً ادیب واقع ہوا ہے اُس کے پاس کوئی چھٹی حس بھی ہوتی ہے عام طور پر ادیبوں کو تن آسان اور کاہل بلکہ بجرالکاہل سمجھا جاتا ہے۔ زندگی کے عام معاملات میں وہ ایسے ہوتے بھی ہیں۔ لیکن جہاں تک شعروادب کا تعلق ہے وہ عام آدمیوں سے کہیں زیادہ جفاکش ہوتے ہیں۔ محنت صرف وال روٹی کے لئے دوڑ دھوپ یعنی دھوپ میں دوڑنے کا نام نہیں ہے۔ بہت سی کتابوں کا غائر مطالعہ، انسانی زندگی اور انسانی فطرت کا گہرا مشاہدہ، خیالات کی تشکیل شعروادب کی تخلیق، مضمون یا کتاب کا لکھنا، اسے صاف کرنا یا اسے سنوارنے اور نکھارنے کے لئے دوبارہ سہ بارہ لکھنا انتہائی محنت کا کام ہے اس سے کسی بھی ادیب کو مفر نہیں خواہ وہ امیر طبقے

ہی سے کیوں نہ ہو۔

ذاتی طور پر آسودہ حال ہونے کے باوجود کوئی ادیب زندگی کی ذہنی، جذباتی اور اخلاقی کشمکش سے محفوظ نہیں رہتا۔ رہ بھی نہیں سکتا۔ اس لحاظ سے ادیب کی مادی آسودگی شعر و ادب کی تخلیق میں کہیں مزاحم نہیں ہوتی بلکہ وہ اور معاون ہوتی ہے۔ اس کے برعکس غربت اور عسرت تخلیقی کاموں میں قدم قدم پر خلل انداز ہوتی ہے۔ مفلوک الحال ادیبوں کو اپنے ذوق اور ضرورت کے مطابق رسالے کتابیں، اور کاغذ تک کی فراہمی میں وہ دشواریاں پیش آتی ہیں کہ نہیں کا دل جانتا ہے۔ بیچارہ بلزاک ضرورت بھر کاغذ کی خریداری کے باعث مقروض رہا کرتا تھا۔ اچھا اور بڑا ادیب بننے کے لیے صرف فطری استعداد کافی نہیں۔ علوم و فنون کی تحصیل و تکمیل بھی ضروری ہے جس کے لیے مفلوک الحال ادیبوں کو نہ مادی سہولیتیں میسر آتی ہیں نہ ذہنی سکون۔ جو ادبا علوم و فنون کی تکمیل سے جس حد تک محروم رہتے ہیں عام طور پر ان کی تخلیقات میں ان کی تمام فطری صلاحیتوں کے باوجود آتنی ہی کمی رہ جاتی ہے۔

تخلیقی کاموں کے لیے دل و دماغ کی جس شگفتگی اور جولانی کی ضرورت ہے خستہ حال ادبا بڑی حد تک اس سے بھی محروم رہا کرتے ہیں۔

ان کی اکثر تخلیقات جبری محنت کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ یہ سمجھ کر کہ اب تو جو کچھ کرنا ہے ان ہی ناساز گار حالات میں کرنا ہے وہ لکھنے پڑھنے کا کام کرتے رہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس ذہنی جبر کا فنی تخلیقات پر کوئی خوشگوار اثر نہ پڑتا ہوگا۔ دل و دماغ کی شگفتگی و عدم شگفتگی زندگی کی طرف ادیب کے رویے کو متعین کرتی ہے۔ مجھے تو زکام جیسے معمولی مرض تک میں زندگی ناقابل برداشت معلوم ہونے لگتی ہے۔ پھر جس کا ذہن ہمیشہ افلاس و افکار کی تلخیوں سے گراں بار رہتا ہو اُس کی افسردگی اور اضمحلال یا زندگی سے بددلی اور بیزاری کا کیا پوچھنا۔ بہت انصاف سے کام لے گا تو یہ رائے قائم کرے گا کہ زندگی اتنی ناخوش گوار نہیں جتنی میری زندگی ناخوشگوار ہے یا دنیا اتنی بری نہیں جتنی مجھے بری لگتی ہے۔ اس قسم کی رائے بہر حال زندگی کی طرف منفی رویے کا اظہار ہے کیونکہ اس میں دنیا کی خوبی و خوبصورتی اور زندگی کی رنگینی و رعنائی کا مثبت اعتراف نہیں پایا جاتا۔ یہ بات ستم ظریفی سے خالی نہیں کہ وہی غربت و عسرت جس کے خلاف ہر زمانے کے ادیب اور شاعر احتجاج کرتے رہے ہیں تخلیقی نقطۂ نظر سے ادیبوں اور شاعروں ہی کے حق میں مفید تصور کی جاتی ہے۔ لیکن ایسا ہونا حیرت انگیز نہیں۔ جو ملک یا معاشرہ ادیبوں کی اقتصادی خوش حالی کی طرف

سے یکسر غافل ہوگا وہ ان کی زبوں حالی کا کوئی جواز یقیناً
ڈھونڈ نکالے گا۔

جو ادیب مستقبل میں پیدا ہوں گے اور جن ادیبوں کی ادبی
حیثیت کو مستقبل میں تسلیم کیا جائے گا وہ تو مستقبل کے ادیب ہیں
ہی لیکن ان کے علاوہ مستقبل کے ادیبوں کی ایک قسم وہ بھی ہے جو اپنے
زمانے میں مشہور و ممتاز ہونے کے باوجود اپنے زمانے میں اس احترام
و افتخار کی نگاہ سے نہیں دیکھے جاتے جس کے وہ مستحق ہوتے ہیں۔ ایسے
ادیبوں کو حالات و حوادث مستقبل کے حوالے کر دیتے ہیں۔ یعنی ان کی
قدر و منزلت کا صحیح احساس اور ان کی اہمیت و عظمت کا مکمل اندازہ
آئندہ نسلوں پر چھوڑ دیا جاتا ہے۔ آئندہ نسلیں اگر ایسے ادیبوں کو پہچانتی
ہیں تو ان کی تعریف میں کہتی ہیں کہ فلاں ادیب اپنے وقت سے پہلے
پیدا ہو گیا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ وہ پچھلی نسلوں کو کوستی بھی ہیں کہ انہوں
نے ایسے جینیئس کو نہیں پہچانا۔ اسے اس کا جائز مرتبہ نہیں دیا گیا
اور اس سے حسد و رقابت روا رکھی گئی۔ بعض مواقع پر اس کی تذلیل
و توہین میں بھی دریغ نہ کیا گیا، اس کی اقتصادی پریشانیوں پر کسی
کو ترس نہ آیا۔ اسے مالی فراغت بہم پہنچانے کے لیے کسی نے کوئی
کوشش نہ کی۔ وغیرہ وغیرہ۔ اس قسم کی کوتاہیوں کے لیے پچھلی

نسلوں کو مطعون کرنا اور ہر دور و ٹھہرانا ایک قسم کا فرض یا فیشن بن چکا ہے۔ جب یہ فرض انجام دیا جاتا ہے تو مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اگر ہماری زبان کا فلاں جینئیس اس دور میں پیدا ہوا ہوتا تو لوگ اسے شیکسپیر کا ہم ردلیف مانتے اور منوالیتے یا نہ ماننے والوں پر عرصۂ زندگی تنگ کردیتے۔ اور جہاں تک اقتصادی امداد کا تعلق ہے آمدنی کے تمام دروازے اس پر کھول دیئے جاتے۔ لیکن جب دیکھتا ہوں کہ دورِ حاضر کے کبھی نابغوں کی زندگی ع

پھرتے ہیں میرؔ خوار کوئی پوچھتا نہیں

کی تفسیر بنی ہوئی ہے تو خیال آتا ہے کہ اچھا ہی ہوا جو فلاں جی نیئس اس دور میں پیدا نہ ہوا ورنہ یہ کبھی ممکن تھا بلکہ عین ممکن تھا کہ احترام و امداد تو ایک طرف ناشر اس کی کتابوں کا معاوضہ اور ریڈیو والے اسے پروگرام تک دینے میں پہلوتہی کرتے۔ ہر دور کے لوگ اپنی مرضی، مصلحت اور مفاد کے مطابق جو چاہتے ہیں کر گزرتے ہیں۔ موجودہ نسلوں کو آئندہ نسلوں کی ملامت کا خیال کبھی نہیں ستاتا۔ ہر دور اپنے نابغوں کے ساتھ ناانصافی کرتا رہا ہے۔ آئندہ نسلیں ہمیشہ شکایتوں اور ملامتوں سے اس ناانصافی کی تلافی کرتی رہی ہیں۔ مگر اس ناانصافی

کا سلسلہ کہیں بند نہیں ہوتا۔ اسی ناانصافی کی بدولت ماضی کے بعض ادیب مستقبل میں دوبارہ جنم لیتے ہیں۔ ادیب کے لئے ماضی اور حال نام ہے زمانے کی ناانصافیوں اور بدسلوکیوں کا۔ اور مستقبل نام ہے تلافیٔ مافات کا۔

۲۹ر اکتوبر ۵۸ء

عزیب شہر سخن ہائے گفتنی دارد

کلکتہ ہندوستان کا سب سے بڑا شہر ہے۔

بمبئی ہندوستان کا سب سے خوبصورت شہر ہے۔

لیکن اپنی پیدائش سے لے کر جب تک میں ہندوستان میں رہا مجھے ہندوستان کے سب سے بڑے اور سب سے خوبصورت شہروں کو دیکھنے کا موقع نہ ملا۔ مجھے اچھے اور بڑے شہروں کو دیکھنے کا جس قدر شوق عطا ہوا ہے اتنا ہی ان کو دیکھنے سے محروم بھی رہا ہوں۔ اب تک جن حالات میں میری زندگی بسر ہوتی رہی ہے ان میں سیر و سیاحت کی نہ صرف کوشش رائگاں جاتی ہے بلکہ خواہش بھی گناہ سے کم نہیں ہوتی۔ لیکن گناہ و عذاب

کا تصور آرزوؤں اور تمناؤں کے لئے برتھ کنٹرول کی حیثیت نہیں رکھتا۔ انسان کے دل میں آرزوئیں اور تمنائیں خود دل کی اجازت کے بغیر پیدا ہوتی رہتی ہیں۔ چنانچہ کلکتہ اور بمبئی کی سیاحت میری مجبوریوں کے باوجود میرے دل کی حسین آرزو اور میری زندگی کا ایک رنگین خواب بن چکی تھی۔ مجھے اس کا ذرا بھی اندازہ نہ تھا کہ یہ آرزو کب پوری ہوگی۔ یہ خواب کب شرمندۂ تعبیر ہوگا۔ واقعہ تو یہ ہے کہ ان شہروں کے لئے روانگی سے دو روز قبل تک میں نہیں جانتا تھا کہ اس خواب کی تعبیر اور اس آرزو کی تکمیل کا وقت اتنا قریب آچکا ہے۔ مجھے کلکتے اور بمبئی جانے کا موقع ایک ساتھ ملا اور اچانک ملا۔ میں نے اس اچانک موقع سے فائدہ اٹھانے کا یک بیک فیصلہ کرلیا۔ کہیں آپ اس اچانک موقع اور فیصلے کو "فرار" کا مہذب مترادف نہ سمجھ لیں۔ کیونکہ "فرار" اور "اچانک سفر" ہم شکل ہوں تو ہوں لازم و ملزوم ہرگز نہیں۔ میرا سفر "سفر برائے سفر" کی حیثیت رکھتا تھا۔ آپ کا جی چاہے تو اسے "رجعت پسند سفر" کہہ لیجئے۔ جس طرح رجعت پسند ادب میں ادب کا جمالیاتی پہلو سب سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے اسی طرح رجعت پسند سفر میں سفر کے تفریحی پہلو کو مرکزی حیثیت حاصل ہے یہ اور بات ہے کہ بعض سر پھرے جمالیات اور تفریحات کو بھی انسانی زندگی کی افادی قدروں میں شمار کرتے ہیں۔

ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ مجھے ہندوستان کے سب سے بڑے اور سب سے خوبصورت شہروں کی سیاحت کا موقع ہندوستان کے دورانِ قیام میں نہ مل سکا۔ یہ موقع مجھے پاکستان میں اگست سنہ ۱۹۵۰ء میں ملا جب مجھے ڈھاکے میں رہتے ہوئے دو سال گذر چکے تھے۔ دیکھنا یہ ہے کہ پاکستان کے سب سے بڑے اور سب سے خوبصورت شہروں کی سیاحت کا موقع "کسن تان" میں جانے کے بعد ملتا ہے۔ اب تک تو یہ حال رہا ہے کہ ڈھاکے میں ڈھائی سال گذار دینے کے باوجود چاٹگام تک رسائی نہ ہو سکی۔ یقین کسی کو میری محرومیوں اور نارسائیوں سے کیا لینا؟

میرے کلکتہ اور بمبئی کے سفر کا باعث میرے کرم فرما معقول علی صاحب ہیں۔ ان شہروں میں عرصہ دراز سے ان کے کاروبار کا سلسلہ چلا آ رہا ہے۔ جب سے انہوں نے پاکستان میں کاروبار شروع کیا ہے سال میں دو ایک مرتبہ کلکتہ اور بمبئی معائنے کے لئے جاتے ہیں۔ اگست میں جب انہوں نے وہاں جانے کا پروگرام بنایا تو مجھے بھی ہمراہی کی دعوت دی۔ جب اُن کی دعوت انتہائی اصرار میں تبدیل ہو گئی تو میں نے چند شرائط کے ساتھ اسے قبول کر لیا۔ آپ پوچھیں گے وہ شرائط کیا تھیں میں جواب میں صرف اتنا کہوں گا حساب دوستاں دردل۔

ہم دونوں ڈھاکے سے ۷ اگست کو ہوائی جہاز پر پاکستانی

گھڑی کے مطابق دن کے ۳ بجے کلکتہ روانہ ہوئے۔ اور ہندوستانی گھڑی کے مطابق دن کے ۳ بجے کلکتہ کے ایروڈرم پر اتر گئے۔ میرے لئے ہوائی سفر کا یہ پہلا اتفاق تھا۔ جی چاہتا تھا کاش ایک گھنٹے کا سفر کئی گھنٹوں میں طے ہو۔ جہاز کی کھڑکی سے جب میں نے روئے زمین پر نظر ڈالی تو محسوس کیا کہ زمین کے فطری حسن کی داد زمین سے بلند ہو کر ہی دی جا سکتی ہے۔

ایروڈرم پر اترنے کے تقریباً دو گھنٹے بعد ہم لوگ قیام گاہ پہ پہنچے۔

دوسرے دن صبح کے وقت ناشتے سے فارغ ہونے کے بعد مقبول صاحب نے اپنے پڑوس کے ایک نوجوان کو جو کالج کے طالب علم ہیں بلا کر مجھے ان کے سپرد کر دیا کہ میں ان کی رہبری میں کلکتے کے ممتاز اور اہم مقامات کی سیر کر لوں۔ چونکہ مجھے نئی چیزوں کی بہ نسبت ادبی شخصیات سے زیادہ دلچسپی ہے اس لئے میں وہاں کے خاص خاص مقامات دیکھنے سے پہلے ڈاکٹر زبیر صدیقی اور یونس احمر سے ملا۔

اردو زبان و ادب سے ڈاکٹر صدیقی کا تعلق کچھ عجیب سا ہے۔ یعنی وہ کلکتہ یونیورسٹی میں شعبۂ عربی کے صدر ہیں مگر ڈھاکا یونیورسٹی کے ساتھ ان کا تعلق URDU EXPERT کی حیثیت سے رہا ہے۔ ان سے یہ میری پہلی ملاقات تھی۔ تقریباً آدھے گھنٹے تک صحبت رہی۔ مجھے وہ بیک وقت سنجیدہ بھی محسوس ہوئے اور ظریف بھی۔ ان کے چہرے کی متانت دیکھتے ہی ایک

مبہم سا خوف میرے دل پر چھا گیا تھا لیکن ان کی گفتگو سے محظوظ ہو کر لوٹا۔

یونس احمر سے یہ میری دوسری ملاقات تھی۔ اس سے پہلے ہم دونوں ڈھاکے میں مل چکے تھے اور بڑی حد تک بے تکلف بھی ہو چکے تھے۔ اردو زبان کے اس کامیاب اور ناقابل فراموش مترجم کو جب میں دیکھتا ہوں یا میرے دل میں اس کا خیال آتا ہے تو میرا ذہن ٹیگور کے افسانوں کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ مجھے یہ محسوس ہونے لگتا ہے کہ یونس احمر اور ٹیگور کے افسانوی نوجوانوں کی شخصیت میں بہت کچھ مشابہت ہے۔ نہ جانے یہ میرا وہم ہے یا واقعہ ہے۔ بہر حال اس کے متعلق میرا تاثر یہی ہے۔

میں کلکتے میں ڈاکٹر زبیر صدیقی اور یونس احمر کے سوا اور کسی سے نہ ملا۔ باقی دن وہاں کی خاص خاص چیزیں دیکھنے میں گذار دیئے۔ مثلاً میوزیم۔ بوٹینیکل گارڈن۔ زوگارڈن۔ بالی گنج لیک۔ دکٹوریہ میموریل۔ کھدر پور ڈوک کچھ عظیم الشان دکانیں اور مشہور سینما ہاؤسیز وغیرہ ان چیزوں کو دیکھ کر میں نے وہی کچھ محسوس کیا جو عام طور پر محسوس کیا جاتا ہے۔ یعنی وہ کیفیت جو حیرت و مسرت کی لہروں کے ٹکرانے سے پیدا ہوتی ہے۔ قدرت اور انسان دونوں کی صنعت گری اور میناکاری کے غیر معمولی نمونے دیکھ دیکھ کر دل ہی دل میں عش عش کرتا تھا اور بار بار میر انیس کا یہ مصرعہ بے اختیار زبان پر آجاتا تھا ؎

حیراں ہوں کہ دو آنکھوں سے کیا کیا دیکھوں

کلکتہ پہنچنے کے چھ دن بعد یعنی ۱۳ اگست کو مقبول صاحب کے ساتھ بمبئی روانہ ہو جانا پڑا۔ یہ سفر ٹرین کے ذریعے سے طے کیا گیا۔ راستے میں کوئی قابل ذکر تجربہ نہ ہوا۔ ہم لوگ ۱۵ اگست کو تقریباً دن کے ایک بجے بمبئی پہنچے۔ اتفاق سے وہ دن ہندوستان کی آزادی کی سالگرہ کا دن تھا۔ خیال تھا کہ اس روز بمبئی جیسے حسین و جمیل شہر کو عروسی لباس میں دیکھنے کی مسرت حاصل ہوگی۔ چنانچہ قیام کے وقت ہم لوگ سیر کی غرض سے نکلے۔ لیکن یہ دیکھ کر بے حد مایوسی ہوئی کہ بمبئی کے صرف وہی حصے جگمگا رہے تھے جہاں مسلمان دکانداروں کی اکثریت تھی۔

بمبئی میں سب سے پہلے جن شخصوں سے میرا تعارف ہوا وہ مقبول صاحب کے دوست حافظ ظہیر الدین صاحب اور ان (مقبول صاحب) کے منیجر محمد مسولیا تھے۔ یہ دونوں ہم لوگوں کو لینے اسٹیشن پر آئے ہوئے تھے۔ حافظ صاحب بمبئی کے باشندے نہیں۔ مگر وہاں پندرہ سولہ سال سے سکونت پذیر ہیں۔ ان کی ذات گرامی ایک طبیب، ایک سرکاری ملازم اور ایک بزنس مین (BUSINESS MAN) کا مجموعہ ہے۔ حد سے زیادہ سیدھے سادے واقع ہوتے ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ مکر و فریب سے بھری ہوئی یہ دنیا حافظ صاحب جیسے آدمی کو کیونکر برداشت کر رہی ہے۔ قدرت نے ان کو دل کی سادگی کے ساتھ مزاج کی ہم صفت شگفتگی بھی عطا کی ہے۔

افسانہ ماننے میں وہ بہت سی گھریلو پریشانیوں میں مبتلا تھے پھر بھی میں نے ان کو ہر وقت مسکراتے ہوئے پایا۔

مسٹر سوامی جیسا کہ نام سے ظاہر ہے ہندو ہیں۔ لیکن ان سے مل کر ہندو مسلم کا فرق ذہن سے غائب ہو جاتا ہے اور صرف اتنا محسوس ہوتا ہے کہ ہم ایک شریف انسان سے مل رہے ہیں۔ وہ مدراس کے رہنے والے ہیں۔ اس لیے انہیں ہندوستانی کی بہ نسبت انگریزی زبان میں گفتگو کرنے میں زیادہ سہولت ہوتی ہے۔ مجھے بمبئی سے آئے ہوئے ابھی کچھ زیادہ عرصہ نہیں ہوا۔ اس کے باوجود وہاں کی کئی مشہور سڑکیں اور چیزیں میرے ذہن سے اتر چکی ہیں۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ میں بمبئی کی جن چیزوں کو کبھی فراموش نہیں کر سکوں گا۔ ان میں حافظ صاحب اور مسٹر سوامی کی شخصیتیں بھی ہیں۔

بمبئی کی عمارتوں، دکانوں، ہوٹلوں، تفریح گاہوں اور سینما ہاؤسیز سے قطع نظر مجھے وہاں کئی دلچسپ چیزیں نظر آئیں۔ مثلاً میں نے وہاں مرہٹی اور گجراتی عورتوں کو دھوتی میں ملبوس دیکھا۔ وہ دھوتی اسی طرح پہنتی ہیں جس طرح مرد پہنتے ہیں۔ البتہ دھوتی کا وہ حصہ جو کمر میں لپیٹا جاتا ہے اسے وہ اپنے جسم کے بالائی حصے پر ڈال لیتی ہیں۔ جب میں نے پہلے پہل دو ایک عورتوں کو ان کی پشت کی طرف سے دیکھا

تو سمجھا کہ یہ پنڈت لوگ ہیں۔ کیونکہ ہندوؤں میں بعض پنڈتوں کے سر بھی عورتوں کے مانند زلف دراز کے حامل ہوتے ہیں۔ جب مجھے معلوم ہوا کہ یہ پنڈت لوگ عورت کے سوا کچھ نکلی نہیں تو میرے ذہن کو ایک دھچکا سا محسوس ہوا۔

مہمانوں کی مدارات کے سلسلے میں بمبئی کی روایات کلکتے سے کسی قدر مختلف ہیں: بمبئی میں جہاں تک پلانے کا تعلق ہے مہمانوں سے یہ ضرور پوچھ لیا جاتا ہے کہ آپ ٹھنڈا پسند کرتے ہیں یا "گرم"؟ یعنی ــــــ Cold drink نوش فرمائیں گے یا Hot drink - مجھے اس ٹھنڈا اور گرم پر ایک لطیفہ اکثر یاد آتا تھا۔ ایک اسکول میں ایک ماسٹر صاحب تھے جو کھانے پینے کے معاملے میں بڑے حریص واقع ہوتے تھے۔ طلبا کو ان کی یہ کمزوری معلوم تھی اور وہ ان کی خاطر مدارات کر کے ان سے ہر قسم کی رعایت اور آزادی حاصل کر لیتے تھے یہاں تک کہ امتحان میں ان کی موجودگی میں اطمینان کے ساتھ چوری بھی کرتے تھے۔ ایک مرتبہ ان کا ایک شاگرد کسی ہوٹل میں بیٹھا کچھ کھا پی رہا تھا۔ آپ اس طرف سے گذر رہے تھے۔ اس کو دیکھ کر ہوٹل میں داخل ہو گئے۔ شاگرد نے پوچھا۔ ماسٹر صاحب لسّی پیجئے گا یا چائے؟

ماسٹر صاحب نے نہایت سنجیدگی سے جواب دیا پہلے ٹھنڈا۔ اس

کے بعد گرم۔"

بمبئی کی سب سے دلچسپ خصوصیت جس سے وہاں کی دولت مندی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے یہ ہے کہ وہاں عام طور پہ ہر سفید پوش کو سیٹھ کہہ کر مخاطب کیا جاتا ہے۔ بمبئی جانے سے پیشتر میں لفظ سیٹھ کو مارواڑیوں کے لیے جو ہندوستان کی سب سے امیر قوم ہے مخصوص سمجھتا تھا لیکن وہاں پہنچ کر جب مجھے اپنی بے مائگی کے باوجود سیٹھ کہلانے کا شرف حاصل ہو گیا تو مجھے اس لفظ کی وسیع المشربی کا اندازہ ہوا۔ دولت مند ہر جگہ ہوتے ہیں۔ لیکن بمبئی کے دولت مند چیزے دیگر کی حیثیت رکھتے ہیں۔

میٹرلی صاحب نے مجھے بتایا کہ بمبئی میں جب کوئی اچھی فلم چل رہی ہوتی ہے تو دو دو روپے کا ٹکٹ بیس بیس روپے تک بلیک مارکیٹ کے ذریعے بکنے لگتا ہے۔ اس سلسلے میں اپنے نئے کرم کرما حافظ صاحب کا ایک تجربہ بیان کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہو گا۔ جن دنوں ہم لوگ بمبئی پہنچے وہاں "شیش محل" فلم چل رہی تھی۔ حافظ صاحب ہم لوگوں کی آمد سے تقریباً پندرہ دن پیشتر اس فلم کے لئے کچھ دوستوں کے ساتھ پیشگی ٹکٹ لے چکے تھے جس دن ان لوگوں کو فلم دیکھنا تھی وقت سے قبل سینما پہنچ گئے۔ حافظ صاحب کے احباب اندر جا کر بیٹھ رہے اور وہ ہاتھ میں ٹکٹ لئے باہر کسی ملاقاتی سے گفتگو کرنے لگے۔ ایک شخص ان

کے پاس آیا اور کہا آپ اپنا ٹکٹ بیچنا چاہتے ہیں؟ حافظ صاحب نے ازراہِ مذاق اثبات میں جواب دیا۔ اس نے پوچھا۔ کیا قیمت لیں گے؟ حافظ صاحب نے دریا تین روپے کے ٹکٹ کی قیمت پچاس روپے مانگی۔ اس نے اپنی جیب سے دس دس روپے کے پانچ نوٹ نکال کر پیش کر دیے۔ حافظ صاحب مبہوت ہو کر رہ گئے۔ مگر پچاس روپے کے لئے انہوں نے اپنے دوستوں کو چھوڑنا گوارا نہ کیا۔

میں نے بمبئی کی عورتوں کو روزانہ زندگی میں جس قدر قیمتی اور زرق برق کپڑے پہنے دیکھا اتنا کسی تیوہار کے موقع پر بھی دوسرے شہروں کی عورتوں کو پہنتے نہیں دیکھا تھا۔ غالبًا یہ کہنا بے جا نہ ہو گا کہ بمبئی کے نسوانی حسن میں "روئے جمیل" سے زیادہ "لباس حریر" کو دخل ہے۔ چنانچہ جب مجھے کسی نسوانی چہرے کو دیکھ کر مایوسی ہوتی تھی تو تلافی کے لئے میں اس کے لباس کو دیکھنے لگتا تھا۔

میں بمبئی دیکھنے کا آرزو مند صرف اس لئے نہ تھا کہ اسے نیاز فتح پوری نے عروس البلاد کہا ہے یا شبلی نعمانی نے اس کی تعریف میں یہ شعر کہا تھا ؎

نثارِ بمبئی کن ہر متاعِ کہنہ و نو را
طراز مسند جمشید و فرِ تاجِ خسرو را

بمبئی دیکھنے کے موجبات ترغیب میں سے ایک اہم چیز وہاں کے ادیبوں خصوصاً ترقی پسند ادیبوں سے ملنے کی آرزو بھی تھی۔ ترقی پسند ادیبوں سے میری دلچسپی اس زمانے سے ہے جب سے مجھے مطالعے کا شوق پیدا ہوا۔ دراصل میرے مطالعے کی ابتدا ہی ترقی پسند ادیبوں سے ہوئی۔ ایک عرصے تک میں ترقی پسند تحریک سے اس حد تک متاثر رہا کہ نہ صرف ترقی پسند ادیبوں کے ناول اور افسانے دلچسپی سے پڑھتا بلکہ ترقی پسند نقادوں کے ہر خیال اور ہر نظریہ پر آمنا و صدقنا بھی کہتا تھا۔ گو اب مجھے ترقی پسند تحریک کے بعض عناصر سے اتفاق نہیں لیکن ترقی پسند ادبا کی شخصیتوں اور تحریروں سے دلچسپی اب بھی ہے چنانچہ بمبئی پہنچ کر میں نے ان سے ملنے کی کوشش کی۔ بمبئی میں کسی کے مکان کا پتا لگانا دوسرے شہروں کی بہ نسبت زیادہ دشوار ہے کیونکہ اوّل تو وہاں مکانوں پر نمبر نہیں ہوتا۔ مکانات اپنے نام سے پہچانے جاتے ہیں۔ دوسرے اس لیے کہ اگر وہاں کسی شخص سے کسی مقام کا پتا دریافت کیجئے تو یا تو وہ ناواقفیت کا اظہار کر دے گا یا غلط راستہ بتا دے گا۔ میں نے سب سے پہلے تاج بک ڈپو جاکر ایک صاحب سے کرشن چندر، سردار جعفری عصمت چغتائی اور کیفی، عظمی وغیرہ کے پتے پوچھے۔ انھوں نے فرمایا کہ چوپاٹی کے قریب (غالباً) راج بھون نام کی ایک عمارت میں کمیونسٹ

پارٹی کا دفتر ہے اگر آپ وہاں چلے جائیں تو ان ادیبوں سے ملاقات ہو جائے گی۔

میں نے کئی فٹن والوں سے کہا کہ چوپاٹی کے قریب راج بھون نام کی ایک عمارت ہے۔ وہاں تک مجھے پہنچا دو سب نے یہی جواب دیا کہ چوپاٹی تک پہنچا دیں گے۔ راج بھون کہاں ہے۔ ہم نہیں جانتے۔ میں نے سوچا چوپاٹی تک پہنچ کر راج بھون کا پتا معلوم کر لینا دشوار نہ ہوگا۔ اس لیے ایک فٹن پر روانہ ہو گیا۔ چوپاٹی بمبئی کی ایک مشہور سیر گاہ ہے جو سمندر کے کنارے واقع ہے وہاں میں نے جس شخص سے بھی کمیونسٹ پارٹی کا دفتر یا راج بھون دریافت کیا اس نے ناواقفیت ظاہر کر دی۔ میں غروب آفتاب کے وقت وہاں پہنچا تھا۔ جب آٹھ بج گئے تو مایوس ہو کر اپنی قیام گاہ پر لوٹ آیا۔

دوسرے روز تقریباً دن کے تین بجے، پھر میں تاج بک ڈپو گیا۔ اور ایک دوسرے صاحب سے ان ادیبوں کا پتا دریافت کیا۔ انہوں نے بتایا کہ مالابار ہل پر تھوڑی دور جانے کے بعد سڑک کے بائیں جانب کمیونسٹ پارٹی کا دفتر راج بھون مل جائے گا۔ وہیں بہت سے ادیبوں سے ملاقات ہو جائے گی۔ آپ ایک ٹیکسی کر لیں تو آسانی سے وہاں تک پہنچ جائیں گے۔ میں نے حسب ہدایت ایک ٹیکسی کر لی اور

ڈرائیور سے کہا کہ مالا بار ہل لے چلو۔ جہاں سے مالا بار ہل شروع ہوا
میں بائیں جانب کی عمارتوں کے نام پڑھتا گیا۔ مجھے راج بھون نظر نہ آیا۔
کچھ دور جانے کے بعد میں نے ٹیکسی رکوا کر ڈرائیور سے کہا کہ آس پاس کے
لوگوں سے یہ پوچھو راج بھون کہاں ہے؟ اس نے کئی آدمیوں سے دریافت
کیا مگر پتا نہ چلا۔ میں نے ڈرائیور سے پوچھا۔ تمہیں معلوم ہے کمیونسٹ پارٹی
کا دفتر کہاں ہے۔؟ اس نے کہا۔ کمیونسٹ پارٹی کا دفتر تو سندھرسٹ روڈ
پر ہے۔ ہم لوگ اسی طرف سے ہوتے ہوئے یہاں آئے ہیں۔ آپ نے
پہلے کیوں نہیں کہا کہ وہاں جانا ہے۔ میں نے کہا خیر۔ اب لے چلو۔ وہاں
پہنچ کر ایک صاحب سے کہا کہ میں اردو کے ترقی پسند ادیبوں سے ملنا
چاہتا ہوں۔ اگر ان میں سے کچھ لوگ یہاں آئے ہیں تو ان سے ملائیے۔
جواب ملا کہ اس وقت ان میں سے کوئی بھی نہیں ہے۔ میں نے کہا عصمت چغتائی
کا پتا بتلائیے۔ انہوں نے کہا کہ جہاں سے مالا بار ہل شروع ہوتا ہے وہاں
سے کچھ دور جانے کے بعد دائیں جانب سیکری بھون نام کی عمارت ملے گی۔
وہی ان کا مکان ہے۔ سندھرسٹ روڈ سے دوبارہ مالا بار ہل گیا۔ جب
عصمت چغتائی کے مکان پر پہنچا تو ان کے بھتیجے سے معلوم ہوا کہ
شاہد لطیف اور عصمت چغتائی سے صرف رات کے وقت آٹھ نو بجے کے
درمیان ملاقات ہو سکتی ہے کیونکہ وہ روزانہ صبح کے وقت اسٹوڈیو چلے
جاتے ہیں اور دن بھر کام میں مصروف رہتے ہیں۔ اس وقت چھ (شام)

بج رہے تھے۔ میں نے سوچا کسی دوسرے دن آٹھ بجے رات کے وقت آنے سے بہتر ہے کہ آج ہی دو گھنٹے کسی طرح گذار کر آٹھ بجے ان سے مل لوں۔ چنانچہ ان سے کہہ دیا کہ آٹھ نو بجے کے درمیان پھر آؤں گا اس کے بعد وقت گذاری کے لئے میں سر فیروز شاہ مہتا گارڈن جسے Hanging garden بھی کہتے ہیں دیکھنے چلا گیا۔ جب ساڑھے آٹھ بجے عصمت کے یہاں دوبارہ گیا تو ایک نوجوان لڑکی سے معلوم ہوا کہ وہ لوگ ابھی تک نہیں آئے۔ میں نے پوچھا۔ اب ان لوگوں سے ملاقات کی کیا صورت ہو سکتی ہے۔ اس نے کہا۔ آپ اتوار کے دن ۴ بجے شام کے وقت دیودار ہال چلے جائیے۔ وہاں ترقی پسند ادیبوں کا ہفتہ وار جلسہ ہوتا ہے۔ وہیں تمام لوگوں سے ملاقات ہو جائے گی۔ میں اس لڑکی سے دیودار ہال کا پتا معلوم کرکے اپنی قیام گاہ پر لوٹ آیا۔

۳۰ اگست کو اتوار کے دن ۴ بجے دیودار ہال روانہ ہوا۔ لیکن اس کی جائے وقوع واضح طور پر ذہن میں نہ تھی بہر حال اس کے قریب پہنچ کر ٹیکسی سے اتر گیا اور تقریباً پندرہ بیس منٹ کی تلاش کے بعد دیودار ہال پہنچ گیا۔ ہال کے سامنے قمیص اور پینٹ میں ملبوس ایک جوان سال وجیہہ صورت شخص کھڑا تھا۔ میں نے پوچھا۔

دیو دار ہال یہی ہے؟

وہ — جی ہاں

میں ترقی پسند مصنفین کا جلسہ یہیں ہوتا ہے۔؟

وہ جی ہاں۔ تشریف رکھئے۔

میں آپ کا اسم گرامی معلوم کر سکتا ہوں؟

وہ مجھے کیفی اعظمی کہتے ہیں۔

میں نے مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا "بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔ میں آپ اور آپ کے دوسرے ساتھیوں سے نیاز حاصل کرنے ہی کے لئے حاضر ہوا ہوں۔ میرا نام نظیر صدیقی ہے میں ڈھاکے سے یہاں چند روز کے لئے آیا ہوں۔

بڑی خوشی ہوئی۔ اندر تشریف رکھئے" کیفی نے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔

آپ کی بڑی عنایت ہوگی اگر آپ دوسرے ادیبوں سے میرا تعارف کرا دیں کیونکہ میں ان میں سے کسی کو بھی نہیں پہچانتا۔" میں نے گذارش کی۔

ہاں ہاں! ضرور ملا دوں گا۔ ابھی تشریف رکھئے۔ وہ دیکھئے مہندر ناتھ کھڑے ہیں۔ (مہندر ناتھ جو کیفی سے دس بارہ قدم کے فاصلے پر کھڑے

ہوئے تھے۔ ان کو مخاطب کرکے) مہندر جی! ان سے ملیے۔ یہ ڈھاکے سے آئے ہیں۔ کیفی نے اپنی جگہ سے ٹلے بغیر یہ سب کچھ کہہ دیا۔

میں مہندر ناتھ کی طرف بڑھ گیا۔ ان سے مصافحہ کیا۔ انہوں نے پوچھا۔ آپ ڈھاکے سے تشریف لائے ہیں۔

میں جی ہاں

مہندر وہاں کے حالات کیسے ہیں۔

میں حالات پر امن ہیں۔ کرشن چندر صاحب ابھی تک آئے یا نہیں۔

مہندر اب آتے ہی ہوں گے۔ تشریف رکھئے۔

میں :- ہاں بیٹھتا ہوں۔ لیکن آپ اتنی زحمت ضرور کیجئے کہ جب کرشن چندر صاحب اور دوسرے ادبا آجائیں تو ان سے میرا تعارف کرا دیجئے۔ کیونکہ میں نے کسی کو دیکھا نہیں ہے۔ پہچاننے میں دقت ہوگی۔

مہندر ضرور۔ ضرور

ہال کے اندر فرش پر تقریباً دس بارہ اصحاب بیٹھے ہوئے تھے۔ اگلی صف کے سامنے ایک میز اور دو کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔ کچھ لوگ دھیمے لہجے میں ایک دوسرے سے گفتگو کر رہے تھے۔ میں سب سے پچھلی صف میں بیٹھ گیا۔ ایک طرف چار پانچ جواں سال خواتین

بھی متقیں نگران میں کسی کی صورت عصمت چغتائی کی تصویر سے مشابہ نہ تھی۔ میرے بیٹھنے کے دس پندرہ منٹ بعد عصمت اور کرشن چندر آئے چونکہ مجھے ان کی تصویریں اچھی طرح یاد تھیں اس لئے ان دونوں کو بیک نظر پہچان گیا۔ مجھے توقع ہوئی کہ شاید اب کیفی یا مہندر ان دونوں سے میرا تعارف کرائیں گے لیکن وہ دونوں ہال میں آکر اگلی صف میں بیٹھ گئے اور کرشن چندر اور دوسرے ادبا کی گفتگو میں شریک ہو گئے۔ کچھ دیر بعد مہندر ناتھ نے کھڑے ہو کر جلسے کی کارروائی کے آغاز کا اعلان کیا اور صدارت کے لئے ایک غیر معروف نوجوان کا نام پیش کیا۔ جب وہ نوجوان کرسیٔ صدارت پر آکر بیٹھ گیا تو پروگرام کے مطابق سب سے پہلے مہندر نے سکریٹری کی حیثیت سے گذشتہ جلسے کی روداد سنائی۔ صدر نے روداد پر تنقید کی دعوت دی۔ لیکن اس میں تنقید کی گنجائش نہیں پائی گئی۔ اس کے بعد ایک صاحب نے نظم پڑھی۔ جب صدر نے حاضرین سے اظہارِ خیال کی درخواست کی تو سب لوگوں کی نگاہیں کیفی پر مرکوز ہو گئیں اور وہ اس خاموش تقاضے کی بنا پر اظہارِ خیال کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ انہوں نے اس نظم کے متعلق جو کچھ کہا وہ اچھی تنقید تھی۔ اس کے بعد افسانہ پڑھنے کے لئے ایک غیر معروف نوجوان کا نام پکارا گیا جس نے "دو منٹ پاتھ کا ڈکیٹر" کے عنوان سے ایک افسانہ پڑھا۔ اس پر دو

صاحبوں نے اظہار خیال کیا۔ اب عصمت چغتائی کی باری تھی۔ انہوں نے "چوتھی کا جوڑا" کے عنوان سے ایک دلچسپ افسانہ پڑھا۔ کئی مقام پر سننے والوں کی زبان سے بے اختیار واہ واہ نکل گئی۔ جب وہ افسانہ پڑھ چکیں تو صدر نے حاضرین کو اس پر عمل جراحی کی دعوت دی۔ کوئی اس کے لیے کھڑا نہ ہوا تو سب کی نگاہیں کرشن چندر پر مرکوز ہوگئیں اور وہ مسکراتے ہوئے اٹھے۔ ان کی مسکراہٹ نے حاضرین اور حاضرات کے لبوں میں بھی ایک متبسمانہ جنبش پیدا کر دی۔ انہوں نے سب سے پہلے متذکرہ نظم کے متعلق کچھ کہا۔ پھر "فٹ پاتھ کا ڈکٹیٹر" پر تنقید کی۔ اس کے مرکزی خیال کو سراہا اور اس کے طنز میں جو خامیاں اور کوتاہیاں تھیں ان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس افسانے کو موثر بنانے کے طریقے بتلائے۔ اس کے بعد عصمت کے افسانے کے متعلق کہا کہ عصمت نے بہت عرصے کے بعد میں ایک اچھا افسانہ دیا ہے۔ اس میں ان کا پرانا رنگ بھی ہے اور نیا رنگ بھی۔ پرانے رنگ سے میری مراد ان کے طنز سے ہے اور نئے رنگ سے میرا مطلب ان کی شاعری سے ہے جو اس افسانے میں کی گئی ہے...... مجھے کرشن چندر کی پوری تقریر یاد نہیں آخر میں انہوں نے غالباً یہ کہا تھا کہ اس افسانے میں چوتھی کا جوڑا کفن بن جاتا ہے۔ یہ کفن در اصل ہماری بوسیدہ سماج

کا کفن ہے۔ اس جملے پر واہ واہ کے ساتھ تالیاں بھی بجیں۔ کرشن چندر کا لہجہ دھیما تھا مگر ان کی تقریر میں وہی سلجھاؤ صفائی اور دل نشینی تھی جو ان کی تحریر کی خصوصیات میں سے ہے عصمت کو افسانہ پڑھتے دیکھکر اور کرشن چندر کی تقریر سن کر مجھے ایسی مسرت ہوئی جو ایک آرزو کے پورے ہونے پر ہوتی ہے۔ عصمت کے افسانے کے بعد ایک صاحب نے ترنم سے ایک غزل سنائی جس پر تنقید کی ضرورت نہیں سمجھی گئی۔

جلسے کی کارروائی ختم ہو گئی۔ اب آئندہ جلسے کے لئے پروگرام مرتب کیا جانے لگا۔ مہندر نے کہا! آئندہ جلسے میں جن صاحبان کو پڑھنا ہے وہ اپنا نام لکھوائیں۔ کسی نے کہا۔ راجندر سنگھ بیدی کا نام لکھئے۔ افسانہ پڑھیں گے۔ کسی نے کہا کیفی اعظمی کا نام لکھئے نظم پڑھیں گے۔ کسی نے کہا! وشوا متر عادل کا نام لکھئے۔ مضمون پڑھیں گے۔ کرشن چندر نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ہاں جب تک ان لوگوں سے لکھوایا نہیں جائے گا یہ لکھیں گے نہیں۔ مہندر نے آئندہ جلسے کا پروگرام سناتے ہوئے کہا۔

"راجندر سنگھ بیدی افسانہ پڑھیں گے"

"کیفی اعظمی نظم پڑھیں گے"

" وشوامتر عادل مقالہ پڑھیں گے"

" اور مہندر جی رپورٹ پڑھیں گے"۔ کرشن چندر نے برجستہ چوتھا مصرع لگا دیا۔ تمام حاضرین ہنس پڑے

جلسہ برخاست ہو گیا۔ سب لوگ اپنے اپنے جوتے سنبھالنے لگے۔ میں نے بھی اپنے جوتے پہنے۔ اور لوگوں کے ہجوم میں ایک ایسی جگہ کھڑا ہو گیا جہاں سے میں کیفیؔ اور مہندر کو دیکھ سکتا تھا اور وہ لوگ مجھے۔ دو تین مرتبہ ہم نے ایک دوسرے کو دیکھا بھی۔ مجھے امید تھی کہ کیفیؔ یا مہندر حسب وعدہ چند ممتاز ادیبوں سے میرا تعارف کرا دیں گے۔ جب دو تین منٹ تک ان میں سے کسی کو اپنے قریب آتے نہیں دیکھا تو خود کیفیؔ کے پاس پہنچا اور ان سے کہا " بھائی! اب تو سب لوگ جا رہے ہیں۔ کیسے ملاقات ہو گی"

کیفیؔ ایک میز سے لگ کر کھڑے ہوئے تھے۔ ان کے بائیں جانب کچھ دوری پر کرشن چندر جوتے پہن رہے تھے اور دائیں جانب ایک صاحب کسی سے گفتگو کر رہے تھے۔

" آپ مل لیجئے نا۔ دیکھئے یہ کرشن چندر ہیں۔ وہ وشوامتر عادل ہیں۔ کیفیؔ نے اپنے دونوں ہاتھوں سے کرشن چندر اور عادل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا"

جب میں نے عادل کی طرف دیکھا تو کیفی نے ان کو مخاطب کر کے کہا۔ "ارے بھائی! ان سے ملو۔ یہ ڈھاکے سے تشریف لائے ہیں۔ اور یہاں کے ادیبوں سے ملنا چاہتے ہیں۔ ذرا ان کو کرشن چندر اور راجندر سنگھ بیدی وغیرہ سے ملا دو۔"

"آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی۔" عادل نے مجھ سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ اچھا ایک ذرا ٹھہریئے! میں جوتے پہن لوں تو آپ کو ان لوگوں سے ملا دوں۔"

عادل جوتے پہن کر کسی سے گفتگو میں مصروف ہو گئے۔ میں ان کے قریب کھڑا رہا۔ عصمت اور کرشن چندر وہاں سے نکل کر سائبان میں کھڑے گفتگو کر رہے تھے۔ جی ڈر رہا تھا کہیں ایسا نہ ہو کہ ممتاز ادبا چلے جائیں اور میری ساری زحمت رائگاں جائے۔ اتنے میں مہندر میرے پاس آئے اور پوچھا کہ۔ آپ ملے؟ میں نے نفی میں جواب دیا۔ مہندر نے کہا۔ "اچھا آیئے۔" وہ مجھے راجندر سنگھ بیدی کے پاس لے گئے اور ان سے میرا تعارف کرا دیا۔ بیدی نے گرم جوشی کے ساتھ مسکراتے ہوئے مصافحہ کیا۔ اور مجھ سے ڈھاکے کے سیاسی حالات دریافت کرنے لگے۔ میں نے بیدی سے تفصیلی ملاقات کی خواہش ظاہر کی۔ انہوں نے پوچھا۔ "یہاں آپ کا قیام کب تک رہے گا۔" میں نے کہا۔ آئندہ

اتوار تک تو ضرور رہوں گا۔"

"اچھا تو ایسا کیجئے کہ آپ آئندہ اتوار کے جلسے میں شریک ہوں۔ اور جلسہ ختم ہونے کے بعد ہم دونوں ایک ساتھ سیر کو چلیں۔" بیدی نے تجویز پیش کی۔

"کیا اس وقت آپ کو فرصت نہیں ہے؟" بیدی نے "آج" کو "آئندہ" پر ترجیح دیتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں اس وقت تو مجھے فرصت نہیں ہے۔ دیکھئے۔ یہ میرے چھوٹے بھائی آج یہاں سے جانے والے ہیں۔ ان کو الوداع کہنے کے لئے اسٹیشن جانا ہے"۔ بیدی نے معذرت پیش کی۔

میں بیدی کے چھوٹے بھائی سے مصافحہ کرتے ہوئے بیدی سے نجی حالات پوچھنے لگا۔ آخر کار یہ طے ہوا کہ ان سے تفصیلی ملاقات آئندہ اتوار کو ہوگی۔ اس مختصر سی گفتگو میں میں نے بیدی کو خلیق ہی نہیں اس سے کچھ سوا پایا۔

بیدی کے بعد مہندر نے محمد مہدی سے میرا تعارف کرایا۔ رسمی طور پر انہوں نے مسرت کا اظہار کیا۔ ان سے میری گفتگو دو تین جملوں تک محدود رہی۔ ابھی میں مہدی کے سامنے کھڑا تھا کہ کرشن چندر نے میری طرف دیکھا۔ مہندر نے کہا۔ آیئے کرشن جی سے ملیے۔ میں نے

فوراً ان کی طرف بڑھ کر ان سے مصافحہ کیا اور قبل اس کے کہ مہندر میرا تعارف کرائیں میں نے خود اپنا تعارف کرالیا۔

"کل کسی نے آپ کا تذکرہ مجھ سے کیا تھا" کرشن چندر نے کہا۔

"میں پرسوں کافی چکر کاٹنے کے بعد عصمت صاحبہ کے یہاں پہنچا تھا۔ ان کا نیاز تو حاصل نہ ہو سکا مگر ان کے ایک بھتیجے سے ملاقات ہوئی تھی۔ میں نے ان سے آپ کے متعلق بھی پوچھا تھا۔ غالباً انہوں نے ہی میرا تذکرہ کیا ہوگا" میں نے قیاس آرائی کرتے ہوئے کہا۔

عصمت چغتائی کرشن چندر کے قریب ہی کھڑی ہوئی تھیں۔ مگر ان کی نگاہ کسی اور طرف تھی۔ کرشن چندر نے ان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "یہ ہیں عصمت" یہ جملہ سن کر عصمت نے میری طرف دیکھا۔ میں نے ان کو سلام کیا اور غیر شعوری طور پر مصافحے کے لئے میرا ہاتھ ان کی طرف بڑھ گیا مگر جواب میں ان کا ہاتھ نہیں بڑھا تو میں نے احساس خفت کے ساتھ اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔ عصمت نے میرے سلام کا جواب دیتے ہوئے کہا۔

"مجھے آپ کے آنے اطلاع ملی تھی"

"اگر آپ کو زحمت نہ ہو تو مجھے تفصیلی ملاقات کا موقع عنایت کیجئے" میں نے گذارش کی۔

"آپ گھر تشریف لائیں" عصمت نے جواب دیا۔

"اس کے لئے آپ کوئی وقت مقرر کر دیں۔ آپ کے بھتیجے نے بتایا تھا کہ آپ بہت مصروف رہا کرتی ہیں" میں نے کہا۔

"نہیں! مصروفیت تو کوئی ایسی نہیں ہے۔ آپ کسی بھی دن دس سے بارہ بجے کے درمیان آسکتے ہیں" عصمت نے اپنی مصروفیت سے متعلق غلط اطلاع کی تردید کرتے ہوئے کہا۔

"اچھا۔ تو دو تین روز کے اندر حاضر ہوں گا"۔ میں نے خود بھی کوئی دن اور وقت مقرر نہیں کیا۔

اس کے بعد عصمت کسی اور سے گفتگو میں مصروف ہو گئیں۔ ان سے کچھ دور ایک طرف کرشن چندر، مہندر اور ایک اور صاحب باتیں کر رہے تھے۔ موخر الذکر نے کہا۔ آج کے جلسے میں ایک نئی اور حسین صورت دیکھنے میں آئی۔

"کون؟ وہ جو........ کے برابر بیٹھی ہوئی تھی؟" مہندر نے پوچھا۔

"ہاں" اس شخص نے جواب دیا۔

"بڑی تندرست ہے" مہندر نے اظہار خیال کیا۔

"تندرست کیوں نہ ہو۔ کمیونسٹ جو ٹھہری" کرشن چندر نے

مسکراتے ہوئے کہا۔"

عصمت جا چکی تھیں۔ کرشن چندر ایک طرف کچھ لوگوں سے گفتگو کرنے لگے۔ مہندر تنہا رہ گئے۔ میں ان کے قریب گیا تو انہوں نے پوچھا۔"

"آپ مل چکے لوگوں سے؟"

"یہاں جتنے ادبا ہیں قریب قریب ان تمام لوگوں سے مل چکا۔" میں نے جواب دیا۔

"ہاں۔ یہاں تو مشہور ادیبوں میں، کچھ زیادہ لوگ ہیں بھی نہیں۔" مہندر نے کہا۔

"آج سردار جعفری نہیں آئے۔" میں نے استفہامیہ انداز میں کہا۔

"وہ لکھنؤ گئے ہوئے ہیں۔" مہندر نے جواب دیا۔

"اور مجروح سلطان پوری؟"

"ان کے نام گرفتاری کا وارنٹ نکلا ہوا ہے۔ وہ روپوش ہیں۔"

"اور نیاز حیدر، تو جیل ہی میں ہیں؟"

"جی ہاں۔"

"دیکھئے۔ میں کرشن چندر صاحب اور آپ سے تفصیلی ملاقات کا خواہش مند ہوں ــ اگر آپ اجازت دیں تو آپ کی قیام گاہ پر حاضر ہوں۔"

شوق سے تشریف لایئے۔"

"اپنا پتا عنایت کیجئے۔"

میں نے اپنی نوٹ بک ان کے سامنے بڑھا دی۔ جب وہ اپنا پتا لکھ چکے تو میں نے کہا۔ کرشن چندر صاحب کا پتا بھی لکھ دیجئے۔ مہندر نے دونوں پتے لکھ دیئے۔ اور راستہ سمجھا دیا۔ میں نے ان کا شکریہ ادا کیا جسے انہوں نے غیر ضروری قرار دیا۔ اس کے بعد وہ کسی کے ساتھ ہو گئے۔ مجھے خیال آیا کہ کرشن چندر کے یہاں نازل ہونے سے پیشتر ان کی بھی اجازت حاصل کر لی جائے۔ وہ اس وقت ہال کے اندر کسی سے گفتگو کر رہے تھے۔ جب باہر نکلے تو مجھے تنہا دیکھ کر پوچھا آپ کسی کا انتظار کر رہے ہیں؟

میں۔۔ جی ہاں آپ ہی کا انتظار کر رہا تھا۔

کرشن چندر۔ فرمایئے۔

میں۔۔ چاہتا ہوں کہ آپ مجھے تفصیلی ملاقات کا موقع عنایت کریں۔

کرشن چندر۔ اس کی تو ایک ہی صورت ہے کہ آپ میرے گھر پر تشریف لائیں۔ مگر وہاں تک آپ بغیر کسی راہنما کے نہیں پہنچ سکتے۔ البتہ دوسری صورت یہ ہے کہ آپ مہندر جی کے یہاں ایک دو بجے کے درمیان آیئں۔ میں دوپہر کا کھانا انہیں کے یہاں کھاتا ہوں وہاں آپ سے

ملاقات ہو جائے گی۔

میں آپ ان کے یہاں کتنی دیر ٹھہرتے ہیں؟

کرشن چندر ایک آدھ گھنٹہ

میں۔ تب تو مجھے بہت کم وقت ملے گا۔

کرشن چندر۔ آپ کے لیے ایک گھنٹہ اور ٹھہر جاؤں گا۔"

میں۔ اچھا تو میں آپ سے ایک دو روز کے اندر مل لوں گا۔"

کرشن چندر۔۔۔ ہاں! ایک دو روز میں مل لیجئے۔ ممکن ہے دو ایک روز کے بعد باہر چلا جاؤں۔"

میں۔۔۔ تب میں کل ہی حاضر ہوں گا۔

کرشن چندر۔۔ آیئے۔

کرشن چندر سے رخصت ہو کر میں پھر مہندر سے ملا اور ان کو اطلاع دے دی کہ کل ان کے یہاں دو بجے آ رہا ہوں

میری جائے قیام بائیکلہ اسٹیشن کے قریب تھی۔ اور مہندر ناتھ دادر میں رہتے ہیں۔ ان دونوں جگہوں کے درمیان جو فاصلہ ہے وہ بس کے ذریعے سے غالباً پندرہ بیس منٹ میں طے ہوتا ہے۔

دوسرے دن میں ایک بجے دادر روانہ ہوا۔ خیال تھا کہ زیادہ سے زیادہ آدھ گھنٹہ ان کے مکان کی تلاش میں صرف ہوگا۔ لیکن دادر پہنچ کر

تقریباً سوا گھنٹے تک چکر کاٹتا رہا۔ مہندر باودھو داس پاپا روڈ پہ ایک فلیٹ میں رہتے ہیں۔ میں دو مرتبہ اس روڈ کے قریب آکر دوسری طرف مڑ گیا۔ میری گمراہی ان لوگوں کی رہین منت تھی جن سے میں نے راستہ پوچھا تھا۔ میں مہندر کے یہاں پہنچنے سے مایوس ہو چکا تھا۔ لیکن آخری کوشش یا یوں کہیے کہ آخری چکر کامیاب رہا۔ ان کے دروازے پر دستک دی۔ انہوں نے دروازہ کھولا۔ ان کے چہرے کا رنگ بتا رہا تھا کہ میری دستک پر نیند سے بیدار ہوئے ہیں۔ خندہ پیشانی سے انہوں نے کہا۔ آیئے۔ ایک قدم کمرے کے اندر رکھ کر میں رک گیا۔ رکنے کی وجہ یہ تھی کہ اس کمرے میں ایک تخت پر ایک ادھیڑ عمر کی عورت اور ایک صوفے پر ایک جواں سال عورت سوئی ہوئی تھی۔ مہندر نے میری ہچکچاہٹ دیکھ کر کہا۔ آجایئے۔ جب میں کمرے کے اندر داخل ہو گیا تو مہندر نے دروازے بند کر دیئے۔ اور مجھے ایک صوفے پر بیٹھنے کے لئے کہا۔ میں بیٹھ گیا۔ میرے برابر ایک اور چوکی بچھی ہوئی تھی جس پر ایک صاحب سوئے ہوئے تھے۔ میں نے ان کو کل کے جلسے میں نظم پڑھتے دیکھا تھا۔ کمرہ نہ بہت چھوٹا تھا اور نہ بہت کشادہ۔ مہندر سے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ ان کی قیام گاہ صرف اسی کمرے سے عبارت ہے۔ یہ صورت حال دیکھ کر

میرے ذہن میں کئی سوالات پیدا ہوئے۔ یہ عورتیں کون ہیں؟ شکل وصورت اور رنگ کے اعتبار سے تو انہیں مہندر کے قریبی رشتہ داروں میں شمار کرتے ہوئے تامل ہوتا ہے۔ کرشن چندر اور مہندرناتھ دونوں وجیہ صورت اور صاف رنگ کے مالک ہیں۔ مگر یہ عورتیں نہ صرف سانولی ہیں بلکہ ان کے چہرے کے خطوط بھی بھدے ہیں۔ مہندر کرشن چندر کے ساتھ کیوں نہیں رہتے؟ کرشن چندر پر لکھنے والوں نے لکھا ہے کہ وہ ایک بہت بڑی عمارت کے مالک ہیں۔ اس کے صرف دو ایک کمرے ان کے استعمال میں رہتے ہیں۔ باقی کمروں میں ان کی مہمان نوازی سے فائدہ اٹھانے والے دوست احباب رہا کرتے ہیں۔ کیا مہندر کے لیے ان کے مکان میں کوئی جگہ نہیں؟ پھر جب کرشن چندر کا اپنا الگ مکان ہے اور ان کے اہل وعیال وہاں رہتے ہیں تو وہ دوپہر کا کھانا مہندر کے یہاں کیوں کھاتے ہیں۔ یہ تمام باتیں میرے لئے معمے کی حیثیت رکھتی ہیں کیونکہ میں نے مہندر سے ان موضوعات پر گفتگو کرنا مناسب نہیں سمجھا۔

میں مہندر کے یہاں تین بجے پہنچا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ کرشن چندر اس وقت تک چلے گئے ہوں گے۔ مگر میری خوش قسمتی کہ اس دن وہ اس وقت تک آئے بھی نہ تھے جب تک وہ نہیں آئے مہندر سے

گفتگو ہوتی رہی۔ انہوں نے مجھ سے ڈھاکے کے ادبی اور سیاسی
حالات پوچھے۔ میں نے ان سے بمبئی کے ادبی حالات معلوم کیے۔
اس سلسلے میں خواجہ احمد عباس کا ذکر چھڑ گیا۔ میں نے پوچھا۔ کیا اب
وہ آپ لوگوں کے جلسے میں کبھی نہیں آتے؟ مہندر نے کہا۔ ہاں جب
سے اختلاف پیدا ہوا ہے وہ شرکت نہیں کرتے لیکن امید ہے کہ وہ
پھر ہمارے حلقے میں آجائیں گے۔ پھر مہندر سے اختلافات کے بارے
میں باتیں ہونے لگیں جو فرقہ وارانہ فسادات کے متعلق خواجہ صاحب
اور ترقی پسند ادیبوں کے درمیان موجود ہیں۔ مہندر نے (ترقی پسندوں
کے نقطۂ نظر سے) خواجہ صاحب کے زاویۂ نگاہ کی کوتاہیاں اُجاگر
کرتے ہوئے کئی باتیں کہیں جو اب مجھے یاد نہیں۔ لیکن اس سلسلے کا
ایک جملہ یاد رہ گیا ہے کہ جو شخص گاندھی ازم کا پیرو ہے وہ کبھی ترقی پسند
نہیں ہو سکتا اس باب میں میں نے اپنے خیالات کا اظہار نہیں
کیا کیونکہ مجھے عافیت اسی میں نظر آئی۔

میں نے پوچھا۔ آج کل ساحر لدھیانوی کہاں ہیں۔ مہندر نے بتایا
کہ کرشن چندر کے یہاں براجمان ہیں۔ مگر انجمن کے جلسے میں اس لیے
شریک نہیں ہوتے کہ ہم لوگوں سے کسی قدر ناراض ہیں۔
یاد نہیں کہ کس عنوان سے میراجی کا تذکرہ آگیا۔ میں نے پوچھا

وہ آپ کی انجمن سے تو وابستہ نہیں تھے؟ مہندر نے نفی میں جواب دیتے ہوئے کہا۔ اگر وہ زندہ رہتے تو یقیناً ترقی پسند تحریک سے وابستہ ہو جاتے۔ اپنی زندگی کے آخر دنوں میں وہ اس تحریک کی اہمیت اور افادیت کے قائل ہو چکے تھے۔ یہاں تک کہ وہ مجھ سے انجمن کی رکنیت کا فارم وغیرہ فراہم کرنے کے لئے کہہ چکے تھے۔"

مہندر نے سردار جعفری اور میراجی کی باہمی چشمک کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ میراجی احساس برتری کے مرض میں مبتلا تھے۔ وہ سردار جعفری کو اپنے مقابلے میں فروتر سمجھتے تھے۔ سردار کو ان کا یہ رویہ قدرتی طور پر کھلتا تھا۔ چنانچہ وہ بھی میراجی کے احساس برتری کو ضرب پہنچانے کا موقعہ ہاتھ سے نہیں جانے دیتے تھے۔

ایک مرتبہ سردار نے "نیا ادب" کے لئے میراجی سے غزل مانگی۔ میراجی نے ایک غزل دے دی۔ سردار نے اسے شائع کرنے کا وعدہ کر لیا۔ مگر کچھ دنوں کے بعد وہ غزل واپس کر دی اور کہا کہ اس میں کچھ خامیاں ہیں انھیں دور کر دیجئے تو شائع کی جائے گی۔ میراجی کو یہ بات بہت بُری لگی۔ اور انہوں نے دوبارہ غزل نہیں دی۔

میں مہندر کی صحبت میں کافی بے تکلفی محسوس کر رہا تھا۔ وہ ایک حد تک ایک دل کھلے دوست کی طرح گفتگو کر رہے تھے۔

میراجی کے سلسلے میں انہوں نے بتایا کہ ان سے میرے تعلقات بڑے گہرے تھے۔ ان سے نہایت بے تکلفانہ گفتگو ہوتی تھی۔ سردار نے ان کی غزل واپس کردی تو ایک دن مجھ سے کہنے لگے "کمیونسٹ بڑے کمینے ہوتے ہیں" اس پر میں نے کہا تم بھی تو کمینے ہو۔ ذرا سی بات پر کدورت رکھتے ہو۔ سردار نے "نیا ادب" میں اگر تمہاری غزل شائع نہیں کی تو اس سے تمہاری شان میں کون سی کمی آ گئی۔ کمیونسٹوں میں کچھ لوگ کمینے ضرور ہیں۔ لیکن چند لوگوں کی بنا پر پوری جماعت اور تحریک کو بدنام کرنا کہاں کا انصاف ہے۔ اور جو لوگ غیر اشتراکی ہیں کیا ان میں کمینے نہیں ہوتے؟"

غالباً اتنی گفتگو کے بعد کرشن چندر آ گئے۔ ان کی آمد کے ساتھ ساتھ بے تکلفی کی وہ فضا جاتی رہی جس میں مہندر سے باتیں ہو رہی تھیں۔ مجھ میں ایک کمزوری یہ ہے کہ بڑے لوگوں کی صحبت میں کوشش کے باوجود بے تکلفی محسوس نہیں کرتا۔ ان سے ملتے وقت ذہن میں ایک عجیب سی گھبراہٹ اور دل میں ایک مبہم سا خوف پیدا ہو جاتا ہے۔ مجھے اعتراف ہے کہ کرشن چندر سے ملاقات کے دوران میں بھی ان کیفیات سے گذرا۔ ان کی ادبی عظمت سے تو مرعوب تھا ہی ان کے طنز نگار ہونے کے خیال سے اور بھی

پریشانی ہورہی تھی۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ نشانہ بن جاؤں۔ مزاح نگاروں اور طنز نگاروں کی طرف سے اس قسم کے اندیشے کا لاحق ہونا فطری بات ہے۔ صاحب سلامت کے بعد جب کرشن چندر بیٹھ گئے تو ایک لمحے کے لیے خاموشی طاری ہو گئی۔ میں سوچنے لگا اس بد نما خاموشی کو کیونکر ختم کیا جائے۔ اتنے میں کرشن چندر نے پوچھا۔ آپ بمبئی پہلی بار آئے ہیں؟

میں جی ہاں

کرشن چندر آپ نے بمبئی کو کیسا پایا؟

میں اس سوال کے کئی جواب ہو سکتے ہیں۔ ایک تو یہ ہے کہ میں نے بمبئی کو کلکتے سے زیادہ خوبصورت اور یہاں کے لوگوں کو نسبتاً زیادہ مہذب پایا۔ مہذب سے میری مراد یہ ہے کہ یہاں کے لوگ دوسرے شہروں کی بہ نسبت ڈسپلن کے زیادہ پابند معلوم ہوتے ہیں۔ مثلاً بس پر سوار ہونے کے لیے قطار میں کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ایک دوسرے کو دھکا نہیں دیتے۔ یہ بات کلکتے میں بالکل نہیں ہے نہ جانے دوسرے بڑے شہروں میں کیا حال ہے۔

مہندر نے میرے خیال کی تائید کرتے ہوئے کہا۔ ہاں یہ صحیح ہے۔ دہلی اور لاہور وغیرہ میں Queue System پر لوگ

عمل نہیں کرتے۔"

دو ایک لمحے کے لئے پھر خاموشی طاری ہو گئی۔ میں نے اسے

دور کرنے کے لئے کرشن چندر سے پوچھا۔ کرشن جی! آج کل کون

کون سی چیزیں زیر تصنیف ہیں۔

کرشن چندر۔ کچھ بھی نہیں۔ جمود طاری ہے۔

میں میرے خیال میں ایک لحاظ سے پورے اردو ادب پر

جمود طاری ہے۔

مہندر نہیں تو۔ اچھی کتابیں اور رسالے تو کافی شائع ہو رہے

ہیں۔

میں میرا مطلب یہ نہیں کہ لکھنے والوں نے لکھنا ترک کر دیا ہے

بلکہ یہ کہ آج کل ایسی چیزیں پیش نہیں کی جا رہی ہیں جنہیں معرکہ آرا کہا

جا سکے۔ نوخیز لکھنے والوں سے ایسے فن پارے کی توقع ایک حد تک

زیادتی ہو گی۔ اور جو لوگ پختہ کار ہیں وہ اتنی عمدہ چیزیں پیش نہیں

کر رہے ہیں، جتنی کہ وہ کر چکے ہیں۔ مثال کے طور پر کرشن جی ہی کو لیجئے

آپ کا نام آتے ہی ذہن "ان داتا" کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔

لیکن جہاں تک مجھے علم ہے ان کے قلم سے "ان داتا" کے پایہ کی کوئی

دوسری چیز اب تک پڑھنے والوں کو نہیں ملی۔"

مہندر نہیں نہیں۔ "ان داتا" کے بعد بھی اس درجے کی چیزیں لکھی گئی ہیں آپ نے "لکشمی کا پل" پڑھا ہے؟"

میں جی ہاں پڑھا تھا۔ پسند بھی کیا تھا۔ لیکن مجھے تو اس درجے کی چیز نہیں معلوم ہوئی۔

مہندر اور "برہم پترا" جو "شاہراہ" میں شائع ہوا ہے آپ کی نظر سے گذرا یا نہیں؟"

میں نہیں

مہندر تو اسے پڑھئے۔ "ان داتا" سے بھی بلند تر تخلیق ہے۔

میں اچھی بات ہے۔ دیکھوں گا۔

کرشن چندر صاحب! تھرڈ ریٹ لکھتے ہیں تو ہیں لوگ اور فورتھ ریٹ لکھتے ہیں تو ہیں لوگ۔ اعتراض کرنے والے تو کبھی اس کمی کو پورا کرکے نہیں دکھاتے۔

میں نے محسوس کیا ع۔

جس سے ڈرتے تھے وہی بات ہوئی جاتی ہے

مجھے یہ بھی محسوس ہوا کہ میں ناگوار حد تک صاف گوئی سے کام لے رہا ہوں۔ چنانچہ میں نے گفتگو کا رخ بدلتے ہوئے کہا۔ ادھر کئی سال سے آپ کے ایک ناول "گدھ" کا اشتہار دیکھتا رہا ہوں اس کی

طباعت میں اتنی دیر کیوں ہو رہی ہے؟"

کرشن چندر وہ ناول لکھا ہی نہیں گیا۔ سو ڈیڑھ سو صفحات لکھنے کے بعد اسے چھوڑ دیا۔

مہندر آج کل ایک دوسرا ناول لکھ رہے ہیں (کرشن چندر کی طرف روئے سخن کر کے) تقریباً نصف حصّے تک پہنچ چکے ہیں؟

کرشن چندر قریب قریب

کرشن چندر نے اب جانے کا خیال ظاہر کیا۔ ان کے اٹھنے سے پیشتر میں نے کہا "کرشن جی! معاشیات کی کسی کتاب میں پڑھا تھا کہ ایک کا فائدہ دوسرے کا نقصان ہوتا ہے آج وہ جملہ اپنی اس ملاقات پر بھی منطبق نظر آتا ہے۔ ایک طرف آپ لوگوں کا وقت ضائع ہوا ہے دوسری طرف میں آپ لوگوں سے مستفید ہوا ہوں۔

کرشن چندر یہ آپ نے سرمایہ داروں کی اکونومکس میں پڑھا ہوگا۔ اشتراکی معاشیات میں ایک کا فائدہ دوسرے کا نقصان نہیں ہوتا۔ (مہندر کی طرف روئے سخن کر کے) سرمایہ دارانہ معاشیات کس قدر گمراہ کن ہے۔ اگر میں نے بی۔اے میں کارل مارکس کی کتاب نہ پڑھی ہوتی تو میرا دماغ خراب ہو گیا ہوتا۔

کرشن چندر کے ان جملوں سے میں خفیف سا ہو گیا۔ وہ جانے

کے لیے کھڑے ہوگئے۔ میں نے اٹھ کر مصافحہ کیا۔ مصافحہ کرتے وقت انہوں نے پوچھا۔ ابھی تو بمبئی میں آپ کا قیام رہے گا؟

میں — جی ہاں

کرشن چندر — آئندہ جلسے میں آپ شریک ہوں گے؟

میں — ارادہ تو ہے۔

کرشن چندر — اچھا تو پھر وہاں ملاقات ہوگی۔

کل کے جلسے میں جب میں کرشن چندر کی آمد کا انتظار کر رہا تھا تو میرے ذہن میں ان کی وہ تصویر رقص کر رہی تھی جو کئی سال پہلے رسالہ "آج کل" دہلی میں دیکھی تھی۔ اور جب کرشن چندر کو میں نے دیکھا تو مجھے ان کی وہ تصویر یاد آئی جو رسالہ "سویرا" کے آخری شمارے میں شائع ہوئی تھی۔ مجھے نہ تو کبھی ان کی تصویریں دیکھ کر مایوسی ہوئی اور نہ خود ان کو دیکھ کر ان کے ایک بلند پایہ فن کار ہونے میں شبہ کرنے کی کوئی وجہ نظر آئی۔ اگر کسی کے ذہن میں یہ خیال جاگزیں ہو کہ "ان داتا" کے مصنف کو گورکی یا کسی دوسرے روسی ادیب سے مشابہ ہونا چاہیے تو یہ اور بات ہے۔ ورنہ کرشن چندر کو دیکھ کر نہ صرف ان کے ادیب ہونے کا احساس ہوتا ہے بلکہ مفکر ہونے کا بھی۔ ان کی شخصیت سے ایک خاص قسم کی سنجیدگی ٹپکتی ہے لیکن

ان کے چہرے پر ہر وقت ایک ایسی مسکراہٹ کھیلتی رہتی ہے۔ جس میں ان کی کوشش کو کوئی دخل نہیں ہوتا۔ ان کا لب ولہجہ فطری طور پر دھیما ہے۔ یہاں تک کہ جب وہ انجمن کے جلسے میں اظہار خیال کے لیے کھڑے ہوتے ہیں اس وقت بھی ان کی آوازمیں زور اور بلند ی پیدا نہیں ہوتی۔ وہ نہایت پرجوش قسم کی بات بھی اپنے مخصوص مدہم لہجے میں کہہ جاتے ہیں۔ جلسے میں جب کوئی شخص کوئی چیز پڑھ رہا ہوتا ہے تو وہ اس انداز سے دوسروں کے چہرے کا جائزہ لیتے رہتے ہیں گویا انہیں جلسے کی کاروائی سے کوئی تعلق ہی نہیں ہے۔ لیکن جب اظہار خیال کے لیے کھڑے ہوتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ سب سے زیادہ توجہ کے ساتھ کرشن چندر ہی سن رہے تھے۔ وہ پان اور سگریٹ دونوں کے شیدائی ہیں لیکن اس سے بھی زیادہ ہر دو تین منٹ پر جیب سے رومال نکال کر اس میں سنکنے کے عادی ہیں اور یہ ان کی ایک ایسی عادت ہے جسے خود ان کے بعض اہل قلم احباب روشناس خلق یا رسوائے عام کر چکے ہیں۔ خیر۔ یہ باتیں ان کے سیرت نگار کا حصہ ہیں۔ مجھے تو صرف اتنا ہی کہنا ہے یا کہنا چاہیے کہ میں نے ان کو بہت ہی با اخلاق اور اجنبی نواز پایا۔

کرشن چندر کے جانے کے بعد میں نے سوچا اب مجھے بھی رخصت ہونا چاہیے ورنہ مہندر ناتھ دل میں کیا کہیں گے۔

چنانچہ میں نے ان سے کہا۔ اب مجھے بھی اجازت دیجئے۔ آپ کا کافی وقت لے چکا ہوں۔ مہندر نے کہا۔ کوئی حرج نہیں۔ ابھی بیٹھیے۔ میں نے جانے پر اصرار نہیں کیا اور بیٹھ گیا۔

"آپ نے اب تک کوئی ناول نہیں لکھا؟" میں نے پوچھا

"آج کل ایک ناول لکھ رہا ہوں"۔ مہندر نے جواب دیا

یاد نہیں کہ کس عنوان سے میرے اور مہندر کے درمیان کرشن چندر کے متعلق گفتگو ہونے لگی۔ اس سلسلے میں مہندر نے ایک دلچسپ بات بتائی۔ انہوں نے کہا۔ جب میرا کسی سے تعارف کرایا جاتا ہے تو اکثر نام بتانے سے پہلے یہ کہہ دیا جاتا ہے کہ کرشن چندر کے چھوٹے بھائی ہیں۔ مجھے اس جملے سے بڑی کوفت ہوتی ہے گویا میری اپنی کوئی حیثیت ہی نہیں ہے۔ کل کے جلسے میں راجندر سنگھ بیدی مجھ پر طنز کر گئے۔ انہوں نے کرشن چندر سے اپنے چھوٹے بھائی کا تعارف کراتے ہوئے کہا۔ "یہ میرے مہندر ناتھ ہیں"۔ میں اس پر ایک بہت سخت جملہ کہنا چاہتا تھا مگر اس خیال سے خاموش رہ گیا کہ شاید ناگوار گزرے۔

"آپ کونسا جملہ کہنا چاہتے تھے؟" میں نے نہایت تجسس کے

ساتھ پوچھا۔

"میں یہی کہتا کہ مہندر ناتھ بننے کے لیے صلاحیت چاہیئے۔"

مہندر نے جواب دیا۔

"واقعی بہت تیز فقرہ ہے۔" میں نے اظہار خیال کیا۔

کرشن چندر کے جانے کے بعد آدھ گھنٹہ گذر گیا تو میں نے سوچا اب ضرور رخصت ہونا چاہیئے۔ چنانچہ اٹھ کھڑا ہوا۔ مہندر سے اجازت طلب کی۔ انہوں نے اٹھ کر مصافحہ کیا۔ کرشن چندر کی آمد کے کچھ دیر بعد دو اور صاحبان کمرے میں آ گئے تھے اور وہ اس وقت تک موجود تھے۔ میں نے ان سے بھی مصافحہ کیا اور مہندر سے پوچھا۔

"آپ لوگوں کی تعریف؟"

"آپ محمد علی ہیں۔ کرشن چندر کے پرائیوٹ سکریٹری اور یہ میرے چھوٹے بھائی ہیں۔" مہندر نے تعارف کراتے ہوئے کہا۔

میں گویا آپ تین بھائی ہیں۔

مہندر جی ہاں۔ اور ایک بہن

میں سرلا دیوی جن کی شادی حال ہی میں ہوئی ہے۔

مہندر جی ہاں

میں آپ کی بھی شادی ہو چکی ہو گی۔

مہندر جی ہاں

میں آپ کے بچے بھی ہیں۔

مہندر (مسکراتے ہوئے) ابھی بچے نہیں ہوئے۔

ان بے معنی سوالات کے بعد میں مہندر سے رخصت ہوا۔
دوسرے روز تقریباً ساڑھے دس بجے (صبح) عصمت چغتائی کے یہاں پہنچا۔ دروازے پر کوئی نوکر نہ تھا۔ میں نے "عصمت صاحبہ" پکارنے کے بجائے "شاہد صاحب" پکارنا بہتر سمجھا۔ گو اب تک ان کی ایک جھلک بھی نہیں دیکھی تھی۔ میری آواز پر کرتے اور پاجامے پر ملبوس پست قد کے ایک صاحب باہر آئے۔ علیک سلیک کے بعد انہوں نے پوچھا "فرمایئے" میں نے کہا۔ میں شاہد لطیف صاحب اور عصمت صاحبہ سے ملنے کے لئے آیا ہوں۔ ترقی پسند مصنفین کے جلسے میں میں نے عصمت صاحبہ سے حاضری کی اجازت لے لی تھی۔ آپ کا اسم گرامی ؟ "مجھے شاہد لطیف کہتے ہیں" یہ کہہ کر وہ اندر چلے گئے۔ ایک لمحہ کے بعد نوکر نے ڈرائنگ روم کا دروازہ کھول دیا۔ میں نے اندر قدم رکھا تو دیکھا کہ ایک گوشے میں ایک بستر پر کیفی اعظمی کروٹ بدل رہے ہیں۔ میرے قدموں کی آہٹ سن کر انہوں نے میری طرف دیکھا تو میں نے سلام کیا اور وہ جواب دے کر سو رہے۔ میں ایک صوفے پر بیٹھ

گیا۔ عصمت کے حسن بھتیجے سے پہلے ملاقات ہوئی تھی وہ آئے اور مجھ سے ڈھاکے کے سیاسی حالات کے متعلق گفتگو کرنے لگے۔ میں ہر لمحہ عصمت چغتائی کا انتظار کر رہا تھا۔ اس طرح تقریباً بیس منٹ گذر گئے تو ایک نوکر دو پیالی چائے لایا۔ عصمت کے بھتیجے نے ایک پیالی میری طرف بڑھائی اور دوسری کے لئے کیفی کو پکارا۔ ابھی وہ انکھیں مل رہے تھے کہ ڈاکیہ آپہنچا جو عصمت کے نام دو ایک اخبار اور کیفی کے نام شاید پانچ روپے کا منی آڈر لایا تھا۔ کیفی ان روپیوں کو وصول کر چکے تو نوکر نے ہنستے ہوئے کہا۔ بابو۔ آپ کے منی آڈر تو خوب ہوتے ہیں۔ کبھی دو روپے کے۔ کبھی تین روپے کے۔ کبھی پانچ روپے کے۔ کیفی بستر سے اٹھے اور کرسی پر بیٹھ کر چائے پینے لگے۔ کچھ دیر ان سے کبھی ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ میں نے پوچھا۔

"مجروح سلطانپوری سے ملاقات کی کوئی صورت نہیں ہے؟"

کیفی نے کہا۔ "نہیں وہ روپوش ہیں۔ گرچہ اسی شہر میں ہیں"

پھر انہوں نے اپنے بارے میں بتایا کہ گرفتاری کا وارنٹ میرے نام بھی ہے اور میں بھی عرصے سے روپوش تھا۔ لیکن ادھر ایک ماہ سے RISK لے کر نکل آیا ہوں۔ پھر میں نے رسالہ "تحریک" کے بارے میں دریافت کیا کہ باقاعدگی کے ساتھ نکل رہا ہے یا نہیں۔

کہنے لگے۔ ادھر ایک ماہ سے نہیں نکلا۔ میں نے پوچھا۔ آخری شمارے کی ایک کاپی مجھے مل سکتی ہے؟ جواب دیا کہ ہاں۔ ضرور اس کے بعد وہ کسی کام سے ایک دوسرے کمرے میں چلے گئے۔

عصمت کے بھتیجے سے دوران گفتگو میں معلوم ہوا کہ یہ مکان دراصل سردار جعفری کا ہے۔ عصمت کا مکان کیڈل کورٹ میں تھا۔ بعض وجوہ سے چھوڑ دینا پڑا۔ سردار کے یہاں عصمت اور شاہد لطیف کا قیام عارضی طور پر ہے۔ کیفی بھی اسی مکان میں رہتے ہیں۔ "تحریک" کا دفتر بھی اسی مکان میں ہے۔

مجھے بیٹھے ہوئے تقریباً ایک گھنٹہ ہو گیا تو میں نے سوچا اب عصمت کے مزید انتظار کی بہ نسبت واپسی زیادہ مناسب ہے۔

"معلوم ہوتا ہے آج عصمت صاحبہ بہت مصروف ہیں"

میں نے کہا۔

"جی ہاں۔ کچھ لوگوں سے ضروری باتیں ہو رہی ہیں"

عصمت کے بھتیجے نے میرے قیاس کی تصدیق کر دی۔

"اچھا تو اب مجھے اجازت دیجئے۔ وقت ملے گا تو پھر حاضر ہوں گا۔ ورنہ انجمن کے آئندہ جلسے میں ملاقات ہو جائے گی۔ ذرا کیفی صاحب سے کہیے کہ وہ "تحریک" کے ایک دو پرچے مجھے

دیدیں" میں نے کہا۔

"اچھی بات ہے" یہ کہہ کر وہ اندر چلے گئے۔ کیفی نے مجھے دو پرچے لاکر دیئے تو میں نے ان کی طرف قیمت بڑھائی۔ انہوں نے کہا "اس کی ضرورت نہیں" میں نے کہا "یہ رسالہ کچھ آپ کی ذاتی ملکیت تو نہیں ہے۔ انجمن کی چیز ہے۔ لہذا اس کی قیمت لینے سے آپ کا انکار غلط ہے"

"ذاتی ملکیت نہ سہی۔ پھر بھی اتنا اختیار ہے" کیفی نے جواب دیا۔ میں پرچے کی قیمت جیب میں رکھنے پر مجبور ہوگیا۔ اس کے بعد میں نے کیفی اور عصمت کے بھتیجے سے مصافحہ کیا اور موخرالذکر سے یہ کہہ کر کہ عصمت صاحبہ کو میرا سلام کہہ دیجئے گا رخصت ہوا۔

بس پر سوار ہونے سے پیشتر خیال آیا کہ آج خواجہ احمد عباس سے بھی ملنے کی کوشش کی جائے۔ مہندر سے ان کا پتا لے چکا تھا۔ ان کے آفس تک پہنچنے میں کوئی دقت نہ ہوئی۔ وہ اپنے آفس میں بیٹھے ہوئے ایک شخص سے اپنے رسالہ "سرگم" کے متعلق کچھ کاروباری باتیں کر رہے تھے۔ میں نے علیک سلیک کے بعد ان سے کہا کہ آپ سے نیاز حاصل کرنے کی غرض سے حاضر ہوا ہوں۔

انہوں نے مجھے ایک کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ تقریباً پانچ منٹ کے بعد وہ شخص چلا گیا تو خواجہ صاحب مجھ سے مخاطب ہوئے۔ پہلے تو مجھ سے ڈھاکے کے سیاسی حالات پوچھے (مجھ سے سیاسی حالات پوچھنے کی خاص وجہ یہ تھی کہ میرے بمبئی جانے کے کچھ عرصہ قبل ڈھاکے اور مشرقی پاکستان کے دوسرے اضلاع میں فرقہ وارانہ فسادات (دنگا) ہوئے تھے) پھر ادبی حالات۔ اس کے بعد میں نے ان سے مختلف موضوعات پر گفتگو کی۔

میں   آپ اردو رسالے کے بجائے ہندی رسالہ کیوں نکالتے ہیں؟۔

خواجہ صاحب   میں جس ہندی میں رسالہ نکال رہا ہوں اس میں اور عام فہم اردو میں کوئی فرق نہیں ہے۔ اور اب اس ہندی کو قائم رکھنا ہمیں جیسے لوگوں کا کام ہے۔

میں   اس کی موجودہ تعداد اشاعت کیا ہے؟

خواجہ صاحب   سات ہزار

میں   کیا اس کی پالیسی وہی ہے جو ترقی پسند رسالوں کی ہوتی ہے۔

خواجہ صاحب   اس کی پالیسی ترقی پسند تو ضرور ہے۔ لیکن میرے

نزدیک ترقی پسندی کا مفہوم دوسرے ترقی پسندوں سے کسی قدر مختلف ہے۔

"ترقی پسندی" کا ذکر چھڑ گیا تو میں نے ادب اور سیاست کے باہمی ربط کے متعلق خواجہ صاحب سے کئی سوالات کئے لیکن اب چونکہ اب ان کے جوابات واضح طور پر یاد نہیں رہے (اور اس کا مجھے بہت افسوس ہے) لہذا ان باتوں کا ادھورا تذکرہ مناسب نہیں معلوم ہوتا۔ البتہ اس سلسلے میں ان کا ایک قول یاد رہ گیا ہے۔ انہوں نے کہا۔

چونکہ ادب زندگی کا ترجمان ہے اور سیاست زندگی کا ایک اہم شعبہ۔ اس لئے ادب سیاست سے بے نیاز نہیں رہ سکتا۔ لیکن ادب کو جماعتی سیاست کے اصول کا پابند بنانا ہرگز مستحسن نہیں۔ ادیبوں کے طرز عمل کو ارباب سیاست کے طرز عمل سے یقیناً مختلف ہونا چاہیئے۔ اگر کوئی ادیب کسی تحریک کے بعض اصولوں سے اختلاف کرتا ہے تو ہم اس کو زیادہ سے زیادہ احمق اور کم فہم کہہ سکتے ہیں۔ ہمیں اس کا حق نہیں کہ اختلاف رائے کی بنا پر اُس کو انسانیت دشمن اور رجعت پسند قرار دیں۔

میں نے کہا۔ کل ایک ترقی پسند ادیب سے ملاقات کے دوران میں فرقہ دارانہ فسادات کے اسباب کے متعلق آپ کے خیالات کا ذکر آیا تو انھوں نے کہا کہ خواجہ صاحب ہندوستانی عوام کی فطرت پر فسادات کی ذمہ داری عائد کرتے وقت اس حقیقت کو نظر انداز کر دیتے ہیں کہ فسادات کے بیج غیر ملکی سامراجیوں نے بوئے تھے۔ اس پر خواجہ صاحب نے کہا لیکن سوال یہ ہے کہ اس بیج کو پانی کس نے پلایا۔ یہ تو ایک کھلی ہوئی حقیقت تھی کہ انگریز "لڑاؤ اور حکومت کرو" کی پالیسی پر عمل کرتے رہے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ ہندو مسلمان انگریزوں کی اس پالیسی سے واقف ہونے کے باوجود کیوں ایک دوسرے سے لڑتے رہے۔ پاگل کتے کا کام ہی ہے کاٹنا۔ اگر وہ ہمیں کاٹ لے تو اس کی ذمہ داری کتے سے زیادہ خود ہم پر عائد ہوتی ہے کہ ہم اس کے پاگل پن کو جانتے ہوئے بھی محتاط نہیں رہے۔ کنوئیں سے اگر آپ خود بچ کر نہیں چلیں گے تو یقیناً آپ اس میں ڈوب مریں گے لیکن اس کے یہ معنی تو نہیں کہ آپ کے ڈوب مرنے کی ذمہ داری کنوئیں پر عائد ہو۔

میں نے کہا۔ ان صاحب نے آپ کے متعلق ایک دوسری بات یہ کہی تھی کہ آپ گاندھی ازم کے پیرو ہیں اور جو شخص گاندھی ازم کا پیرو ہے وہ ترقی پسند نہیں ہو سکتا۔ اس پر خواجہ صاحب نے کہا۔ میں گاندھی ازم کا FOLLOWER ضرور ہوں لیکن BLIND FOLLOWER ہرگز نہیں۔ مجھے اس کے متعدد عناصر سے اختلاف ہے لیکن ان اختلافات سے قطع نظر میں گاندھی ازم کو ترقی پسندی کے

منافی نہیں سمجھتا۔

میں نے پوچھا۔ آپ کے نزدیک اشتراکی نظام حمایت کے قابل ہے یا نہیں۔ خواجہ صاحب نے کہا۔ ضرور ہے گو مجھے کارل مارکس سے پورا پورا اتفاق نہیں۔

خواجہ صاحب کے سامنے میں نے جن موضوعات کو چھیڑا وہ سب کے سب کافی وقت کے محتاج تھے۔ اس لئے میں کسی بھی موضوع کی تفصیلات میں نہ جا سکا اس کا جو نتیجہ ہونا چاہئے تھا وہ آپ کے سامنے ہے۔ اس مضمون میں خواجہ صاحب کے خیالات زیادہ تر اپنے الفاظ میں پیش کئے جا رہے ہیں کیونکہ اب مجھے ان کے الفاظ تو خیر ان کے خیالات کے تمام اجزا کو بھی یاد کرنے میں دقت محسوس ہو رہی ہے

خواجہ صاحب سے تقریباً آدھ گھنٹہ گفتگو کرنے کے بعد میں نے کہا۔ "اب مجھے اجازت دیجئے۔ میں آپ کے OFFICE HOURS میں کافی مخل ہوا۔" اس پر خواجہ صاحب نے کہا۔ "آپ کے آنے سے کوئی حرج نہیں ہو رہا ہے۔ ابھی کچھ دیر اور بیٹھئے۔" میں نے جانے پر کوئی اصرار نہیں کیا۔

میں نے پوچھا: "سعادت حسن منٹو کی کتاب "سیاہ حاشیہ" اور ان کی طرف ترقی پسند ادیبوں کا جو رویہ ہے اس کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟"

خواجہ صاحب نے جواب دیا۔ "سیاہ حاشیہ مجھے پسند نہیں۔ فسادات جیسا المیہ موضوع یقیناً اس لائق نہیں کہ اس پر لطیفے اور چٹکلے لکھے جائیں۔ لیکن

اس کے باوجود منٹو کی طرف ترقی پسند ادیبوں کا جو رویہ ہے وہ میرے نزدیک صحیح نہیں۔ منٹو ایک CYNIC اور INDIVIDUALIST ہے وہ ہمیشہ نئے نئے تجربے کرتا رہتا ہے۔ ان میں سے بعض تجربے کامیاب ہوتے ہیں اور بعض ناکامیاب "سیاہ حاشیہ" ایک ناکامیاب تجربہ ہے۔ اس کی بنا پر منٹو کو رجعت پسند کہنا درست نہیں خصوصاً جبکہ فسادات پر منٹو نے اچھے افسانے بھی لکھے ہیں۔

جب مجھے ان کے دفتر میں بیٹھے ہوئے پون گھنٹہ گذر گیا تو میں نے دوبارہ ان سے رخصت کی اجازت مانگی۔ انھوں نے یہ کہتے ہوئے مصافحہ کیا کہ "آج تو آپ نے بڑے لمبے لمبے موضوع چھیڑ دیئے۔ اس طرف سے پھر کبھی گذرنے کا اتفاق ہو تو تشریف لائیے گا۔"

غالباً یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ میں نے خواجہ صاحب کو بہت ہی خلیق پایا۔ اخلاق اجنبیوں کے لئے ہوتا ہے اور اخلاص دوستوں کے لئے۔ خواجہ صاحب سے مل کر مجھے محسوس ہو رہا تھا جیسے میں اخلاق و اخلاص دونوں سے سرفراز ہوا۔

خواجہ صاحب سے ملنے کے بعد تین ممتاز شخصیتیں ایسی رہ گئی تھیں جن سے ملنے کا مجھے گہرا اشتیاق تھا۔ آرزو لکھنوی، ساغر نظامی اور ساحر لدھیانوی۔ موخرالذکر سے ملنے کے لئے کرشن چندر کے مکان پر جانا ضروری تھا۔ اور وہاں تک پہنچنے میں کئی قباحتیں تھیں۔ لہذا وہاں جانے کا خیال ہی ترک کر دینا پڑا۔ ساغر نظامی کے یہاں ایک بار گیا تو ان سے ملاقات نہ ہو سکی دوبارہ جانے کا موقعہ نہ مل سکا۔ البتہ

آرزو لکھنوی سے نیاز حاصل کرنے کی کوشش کامیاب رہی۔ جب میں ان کے فلیٹ پر پہنچا تو وہ بنیائن اور لنگی پہنے ہوئے اپنے کمرے سے نکلے۔ علیک سلیک کے بعد مصافحہ کیا۔ جب میں اپنا تعارف کرا چکا تو انھوں نے کمرے میں بٹھایا اور مجھے اندر سے گئے۔ کچھ ہی دیر بعد انہوں نے نوکر کو حکم دیا کہ دو پیالی چائے لے آئے۔ میں نے کہا۔ آپ یہ تکلیف نہ کریں۔ لیکن خاطر مدارات کے معاملے میں میزبان مہمان کی سنتا کب ہے۔ چنانچہ چائے آئی اور پینا پڑی۔ قریب ہی پاندان رکھا ہوا تھا۔ آرزو صاحب چائے کے بعد پاندان اپنے سامنے رکھ کر پان بنانے لگے۔ جب انہوں نے میری طرف پان بڑھایا تو میں نے اس عذر کے ساتھ کہ عادت نہیں ہے پان لینے سے انکار کر دیا۔ یہاں اپنی عادت پر قائم رہنے کا سوال اتنا نہ تھا جتنا ان کی بزرگی کے احترام کا۔ ضعیف العمری نے آرزو صاحب میں ثقل سماعت کی شکایت پیدا کر دی ہے۔ اس لئے گفتگو کرنے میں اکثر جملوں کو دہرانا پڑتا تھا۔ ان سے کوئی ادبی گفتگو نہیں ہوئی۔ انہوں نے کچھ ذاتی حالات بتلائے اور کچھ زمانے کے حالات پر اظہار خیال کیا۔ اپنی ایک سالہ علالت کا تذکرہ کرتے ہوئے انہوں نے اپنی پیٹھ کے اس زخم کا نشان دکھایا جو اس وقت تک مندمل ہو چکا تھا۔ بمبئی جانے سے پیشتر میں سمجھتا تھا کہ آرزو صاحب کراچی میں ہیں۔ لیکن بمبئی پہنچنے پر معلوم ہوا کہ آرزو صاحب یہیں ہیں۔ ان سے ملاقات کے دوران میں جب ان سے میں نے اپنے اس غلط علم کا اظہار کیا اور ان سے کراچی نہ جانے کی وجہ پوچھی تو انہوں نے فرمایا "میں کراچی میں رہنا تو ضرور چاہتا ہوں لیکن اب تک اس کی کوئی سبیل نہ نکل

سکی حالانکہ کراچی میں تعلقات کے لوگ کافی ہیں اور ان میں سے کئی اشخاص ایسے ہیں جو صاحب اقتدار بھی ہیں لیکن اب وہ لوگ نہ صرف مجھے بھول چکے ہیں بلکہ اپنے اس زمانے کو بھی جب وہ ہر روز میرے یہاں حاضری دیتے تھے۔ تقریباً آدھ گھنٹے تک ان کے پاس بیٹھنے کے بعد میں نے ان سے رخصت چاہی کیونکہ قرینے سے معلوم ہوتا تھا کہ میری موجودگی سے مستورات کے کام کاج میں خلل اندازی ہو رہی ہے۔ آرزو صاحب نے کہا کہ میں شام کے وقت چار بجے سے ۹ بجے رات تک قریب کی مسجد میں بیٹھتا ہوں۔ اگر آپ کو وقت ملے تو وہاں تشریف لائیے۔ اطمینان سے گفتگو ہوگی۔ جب میں ان سے رخصت ہونے لگا تو انھوں نے کہا کہ ڈھاکے میں جو لوگ میرے ملنے والوں میں سے ہوں ان کو میرا سلام عرض کر دیجئے گا۔

آرزو صاحب سے ملاقات کے دوران میں ایک دلچسپ واقعہ پیش آیا۔ وہ یہ کہ جب ہم دونوں کمرے میں بیٹھ گئے تو انھوں نے مجھ سے ڈھاکے کے متعلق کچھ باتیں دریافت کیں۔ اس وقت ان کا نوکر جس کی عمر تقریباً آٹھ نو برس ہوگی قریب ہی کھڑا ہوا تھا۔ ڈھاکے کا نام سن کر اس کے چہرے پر ایک مسرت آمیز کیفیت نمودار ہوگئی۔ جب اس نے دیکھا کہ میں آرزو صاحب سے رخصت ہو رہا ہوں تو کمرے سے نکل کر COR-RIDOR پر کھڑا ہوگیا۔ جب میں اس کے قریب سے گذرنے لگا تو اس نے مسکراتے ہوئے پوچھا آپ ڈھاکے سے آئے ہیں؟

ہاں میں ڈھاکے سے آیا ہوں۔ کیوں؟

میرا ابھی گھر وہیں ہے۔

اچھا۔

آپ واپس کب جائیں گے؟

دو چار روز میں۔

یہ گفتگو ہو رہی تھی کہ آرزو صاحب نے اسے آواز دی اور میں یہ کہتا ہوا کہ "جاؤ تمہیں آرزو صاحب بلا رہے ہیں" آگے بڑھ گیا۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ مجھ سے کچھ دیر اور باتیں کرتا۔ لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ آج بھی جب اس کی اس مسرت کا خیال آتا ہے جو ڈھاکے کا نام سن کر یا مجھے ڈھاکے کا آدمی سمجھ کر اس کے دل میں پیدا ہوئی تھی تو میں اپنے دل میں ایک عجیب سی کیفیت محسوس کرتا ہوں۔ کون جانے وہ مجھ سے اپنے وطن کے بارے میں کیا کچھ پوچھنا چاہتا تھا۔

خواجہ احمد عباس اور آرزو لکھنوی سے مجھے دوبارہ ملاقات کا موقع نہ مل سکا۔ اتوار کو ترقی پسند مصنفین کے جلسے میں شرکت کے لئے چار بجے دیوڈار ہال پہنچ گیا۔ مگر اس وقت تک دو چار نوجوانوں کے سوا کسی کو پتا نہ تھا۔ سائبان میں ایک بنچ پر ایک صاحب بیٹھے ہوئے تھے۔ میں ان کے برابر بیٹھ گیا۔ شرکائے جلسہ کی تعداد میں تدریجی اضافہ ہوتا گیا۔ تقریباً پندرہ منٹ کے بعد چھ سات حضرات ایک ساتھ کمرے میں داخل ہوئے۔ ان میں محمد مہدی اور کیفی اعظمی بھی تھے۔ میں نے کیفی کی طرف دیکھتے ہوئے ہاتھ سے سلام کیا۔ لیکن وہ اس طرح میرے قریب سے گذر گئے جیسے مجھے دیکھا ہی نہیں۔ کچھ دیر بعد مہندر ناتھ آئے۔ انہوں

نے مجھے دیکھتے ہی علیک سلیک کیا۔ اور قریب آکر معانقہ اور مزاج پرسی بھی کی۔ پھر اندر چل کر بیٹھنے کے لئے کہا۔ اب کے بار بھی میں پچھلی صف میں جا کر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر بعد کرشن چندر آئے۔ میں نے ان کے قریب پہنچ کر ان سے صاحب سلامت کی۔ پھر اپنی جگہ پر آکر بیٹھ گیا۔ اب جلسے کی کارروائی شروع ہونے والی تھی۔ آج پڑھنے والوں میں وشوامتر عادل اور کیفی اعظمی تیار ہو کر نہیں آئے تھے۔ اور راجندر سنگھ بیدی سرے سے غیر حاضر تھے۔ اس لئے کیفی ہاتھ میں قلم اور کاغذ لئے ہوئے حاضرین میں بعض لوگوں سے کہہ رہے تھے کہ تم کوئی چیز پڑھو۔ اس سلسلے میں انھوں نے مجھ سے بھی پوچھا کہ آپ کچھ پڑھیں گے۔ میں نے نفی میں جواب دے دیا۔ بہرحال محمد مہدی کی صدارت میں کارروائی شروع ہو گئی۔ مہندر نے گذشتہ جلسے کی روداد میں ایک جگہ لکھا تھا کہ عصمت افسانہ پڑھتے وقت شرما رہی تھیں۔ اس جملے پر اعتراض کیا گیا تو کرشن چندر نے دبی زبان سے ترمیم پیش کرتے ہوئے کہا "گھبرا رہی تھیں" لکھنا کافی تھا۔ میں نے دونوں جلسوں میں دیکھا کہ جب کوئی چیز پڑھی جا چکی تو تنقید کے لئے تمام نگاہیں خصوصیت کے ساتھ کیفی اور کرشن چندر کی طرف اٹھتی تھیں۔ خواتین جن میں نوجوان لڑکیاں زیادہ تھیں۔ ان میں سے میں نے کسی کو بحث مباحثے میں حصہ لیتے ہوئے نہیں دیکھا۔ کیفی اعظمی کی حرکات و سکنات کو میں نے سب سے زیادہ نگاہوں (خصوصاً نسوانی نگاہوں) کا محور پایا۔ اسی جلسے میں میں نے مہدی کو پہلی بار اور کرشن چندر کو دوسری بار اظہار خیال کرتے سنا۔ مہدی اپنے مافی الضمیر کے ادا کرنے میں

کافی اٹکتے نظر آئے۔ کرشن چندر کی تقریر جیسی گزشتہ جلسے میں ہوئی تھی ویسی ہی اس وقعہ بھی ہوئی یعنی تقریر میں روانی اور تیزی تو نہ تھی لیکن خیالات سلجھے ہوئے اور الفاظ صاف اور سادہ تھے۔

اس جلسے میں عصمت چغتائی اور راجندر سنگھ بیدی نہیں آئے۔ مجھے بیدی کے نہ آنے پر بڑی مایوسی ہوئی اور یہ شعر بھی یاد آیا ؎

ان کی یہ خوبیٔ اخلاق کہ وعدہ تو کیا
میری یہ شومیٔ تقدیر کہ ایفا نہ ہوا

جلسہ ختم ہونے کے بعد میں مہندر سے کچھ باتیں کرنے لگا۔ اتنے میں ظ۔ انصاری ان کے پاس آئے۔ چونکہ مہندر کے گھر پر ظ۔ انصاری کے بارے میں کچھ باتیں ہوئی تھیں اور میں نے ان سے ملنے کا اشتیاق ظاہر کیا تھا اس لئے مہندر نے ان سے میرا تعارف کرا دیا۔ مگر ان سے کوئی قابل ذکر گفتگو نہ ہو سکی۔ میں نے مہندر سے رخصت ہوتے وقت بتایا کہ کل بمبئی کو خیرباد کہہ رہا ہوں۔ ترقی پسند ادیبوں میں میری طرف سب سے زیادہ التفات آمیز سلوک مہندر کا تھا۔ جب میں نے اس بات کے لئے ان کا شکریہ ادا کیا تو انہوں نے کہا۔ "اس میں شکریے کی کون سی بات ہے۔ انجمن کے سکریٹری کی حیثیت سے میرا فرض تھا کہ ملنے ملانے میں آپ کی مدد کروں"! یہ جملہ سن کر ایک لمحے کے لئے یہ سوال میرے ذہن میں پیدا ہوا۔ "کیا میرے ساتھ مہندر کا اخلاق و اخلاص محض OFFICIAL تھا؟"

لیکن پھر میں نے محسوس کیا کہ اگر وہ سکریٹری نہ ہوتے جب بھی اخلاق و توجہ کے ساتھ پیش آتے۔

مہندر سے رخصت ہو کر میں کرشن چندر سے ملا۔ انہیں بھی میں نے بتایا کہ کل بمبئی کو خیر باد کہہ رہا ہوں۔ انہوں نے گرمجوشی کے ساتھ الوداعی مصافحہ کرتے ہوئے کہا کہ عندلیب شادانی صاحب کو میرا سلام کہہ دیجیئے گا۔

دوسرے روز یعنی پیر کو شام کی ٹرین سے مقبول صاحب کے ساتھ کلکتہ روانہ ہوا۔ وہاں تین چار روز ٹھہرنے کے بعد ہوائی جہاز سے ہم لوگ ڈھاکے آ گئے۔ میرے دوستوں اور واقف کاروں کا حلقہ مختلف مذاق و میلان کے لوگوں پر مشتمل ہے۔ سفر سے واپسی کے بعد جب ایک کرم فرما سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے کہا۔ بھئی! تم تو بڑے خوش نصیب ہو۔ بمبئی سے ہو آئے وہاں ثریا اور نرگس کی ایک جھلک تو ضرور دیکھی ہو گی۔ ؟!

اور ایک دوسرے مہربان نے پوچھا۔ یار بمبئی تو حسن کدہ ہے۔ وہاں کسی سے آنکھ لڑی تھی یا نہیں؟ اب ان سوالوں کے جواب میں

ع کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا؟

۱۹۵۱ء

اشتہار یا انکشاف

میں واقعی بڑی الجھن میں ہوں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں اردو کتابوں کے اشتہار کو اشتہار سمجھوں یا انکشاف۔ آپ کہیں گے غالباً اردو ادب سے متعلق تمہاری معلومات یا تمہارا مطالعہ حد درجہ محدود ہے اس لئے تمہیں اشتہار بھی انکشاف معلوم ہوتا ہے۔ لیکن یقین مانئے کہ آپ کا قیاس صحیح نہیں۔ میں نے ہمعصر نوجوانوں کی طرح جنسی اور جاسوسی ناولوں کو اپنے ادبی ذوق کی تسکین کا ذریعہ کبھی نہیں بننے دیا۔ اور نہ کبھی اپنے ادبی ذوق کو صرف ناولوں اور افسانوں کے مطالعے تک محدود رکھا لیکن خدا گواہ ہے کہ اردو شعر و ادب کے بارے میں جو باتیں تنقیدی کتابوں اور تنقیدی مضامین سے مجھے معلوم نہیں ہو پاتیں وہ اردو کتابوں کے اشتہار

سے معلوم ہو جاتی ہیں۔ ان کے معلوم ہو جانے پر کوئی اعتراض نہیں لیکن چونکہ وہ باتیں اس جھٹکے یا دھاکے کے ساتھ علم میں آتی ہیں جو ہر انکشاف کا خاصہ ہے اس لئے حیران و پریشان ہو کر سوچنے لگتا ہوں کہ میں کسی کتاب کا اشتہار پڑھ رہا ہوں یا مجھ پر کسی راز کا انکشاف ہو رہا ہے مثلاً ابھی حال ہی کی بات ہے۔ میں ایک رسالے میں نفیس نمزوہی کی ایک تازہ تصنیف کا اشتہار دیکھ رہا تھا۔ ان کے بارے میں سب لوگوں کی طرح مجھے بھی معلوم تھا کہ وہ روزانہ اخبار "جہاد" میں ہر روز کسی اخباری خبر پر دو شعر کا قطعہ لکھا کرتے ہیں جسے زیادہ سے زیادہ صحافتی شاعری کہہ سکتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ صحافتی شاعری کرنے والا کس درجے کا شاعر ہو سکتا ہے۔ لیکن جب ان کی نئی تصنیف "شورش دریا" کے اشتہار کے ان الفاظ پر نظر پڑی

شورشِ دریا

اردو کے عظیم ترین شاعر نفیس نمزوہی کا تخلیقی اعجاز

تو میں دم بخود ہو کر رہ گیا۔ میں ابھی تک میر، غالب اور اقبال ہی کے بارے میں فیصلہ نہ کر سکا تھا کہ ان تینوں میں سے کس کو اردو کا عظیم ترین شاعر مانوں۔ اب یہ فہرست تین سے گذر کر چار

تک جا پہنچی ۔ میرؔ، غالبؔ، اقبالؔ اور نفیسؔ بمزوہی۔ میرؔ غالبؔ اور اقبالؔ میں عظیم ترین کون ہے ؟۔ یہ بات سمجھ میں نہیں آتی تو نہ سہی ۔ اتنی بات تو واضح تھی کہ یہ تینوں عظیم شاعر ضرور ہیں ۔ لیکن نفیسؔ بمزوہی کا عظیم ہونا بھی سمجھ میں نہ آسکا۔ ان کو عظیم تسلیم کرنے کے لئے میں نے یکے بعد دیگرے کئی نقطۂ نظر اختیار کئے۔ مثلاً جب میرؔ، غالبؔ اور اقبالؔ کے ساتھ ان کی عظمت سمجھ میں نہ آئی تو میں نے دل میں کہا ۔۔ یہ موازنہ ٹھیک نہیں ۔ زندوں کا مردوں کے ساتھ موازنہ ہرگز ٹھیک نہیں ۔ میرؔ، غالبؔ اور اقبالؔ کی سطح پر نفیسؔ بمزوہی کا عظیم ہونا مشتبہ سہی لیکن اپنے معاصرین کے مقابلے میں ان کا عظیم ہونا ممکن ہے بلکہ عظیم ترین ہونا بھی ۔ چنانچہ میں نے انہیں ان کے معاصرین سے ٹکرا کے دیکھنے کی کوشش کی ۔ لیکن اس میں قباحت یہ آپڑی کہ ان کے معاصرین میں جو شعرا ان سے کہیں زیادہ مشہور و ممتاز تصور کئے جاتے ہیں (مثلاً فراقؔ، فیضؔ، جوشؔ) انہیں بھی آج تک کسی نقاد نے عظیم شاعر کے خطاب سے نہیں نوازا ۔ اب اگر نفیسؔ بمزوہی اردو کے عظیم ترین شاعر ہیں تو ان کا غیر عظیم شعرا سے موازنہ کیا معنی ؟۔ غرض کہ نفیسؔ بمزوہی کی شاعرانہ عظمت کو سمجھنے کے لئے موازنے والی ترکیب ہر لحاظ سے ناکام رہی ۔ اور جب کوئی دوسری ترکیب

سمجھ میں نہ آئی تو میں نے دل میں یہ کہہ کر اس مسئلے سے جان چھڑائی کہ عظیم شاعر کی عظمت عموماً اس کے زمانے کے لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتی۔ اسے ہمیشہ آئندہ زمانے والے بہتر سمجھتے ہیں۔ مثلاً غالب کے ساتھ ایسا ہی ہوا تھا۔ اقبال کے ساتھ بھی ایسا ہی ہونا چاہیے تھا۔ مگر لوگوں نے ہونے نہ دیا۔ ممکن ہے نفیس نمرو ہی بھی اس قبیل یا قبیلے کے شاعر ہوں۔ ان کی عظمت کو سمجھنے کی بجائے انہیں آئندہ نسلوں کے لیے چھوڑ رکھنا بہتر ہوگا۔ آئندہ نسلیں خود ان سے سمجھ لیں گی۔

نفیس نمرو ہی کی تصنیف کے اشتہار نے مجھے جس ذہنی الجھن میں ڈال دیا تھا ابھی اس سے نکلنے بھی نہ پایا تھا کہ کسی رسالے میں ایک اور چونکانے والا اشتہار نظر پڑ گیا۔ اشتہار یہ تھا:۔

آصف مجازی کی عہد آفریں تصنیف

کچھ آہیں کچھ واہیں

شائع ہو گئی

اشتہار پڑھتے ہی ذہن میں فوراً سوال پیدا ہوا کہ یہ آصف مجازی کون ہے۔ عہد آفریں تصنیف کے اس مصنف کی کوئی اور چیز میری

نظر سے گذری ہے یا نہیں۔ معلوم ہوا کہ ہر قسم کی اچھی کتاب اور ہر قسم کا معیاری رسالہ پڑھتے رہنے کے باوجود آصف مجازی سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ خیر آج ہو گئی۔ اس میں کیا مضائقہ ہے۔ مضائقہ تو کچھ بھی نہیں۔ لیکن مسئلہ یہ پیدا ہو گیا کہ اردو ادب کے جس دور کو جمود کا دور کہا جا رہا ہے اور جس دور میں اچھے سے اچھا لکھنے والا کوئی عہد آفریں تصنیف پیش نہیں کر پا رہا اس دور میں آصف مجازی جیسے غیر معروف لکھنے والے کے قلم سے کسی عہد آفریں تصنیف کی توقع کی جا سکتی ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ عہد آفریں کے الفاظ صرف اشتہار کی خاطر استعمال کئے گئے ہیں یا کتابت کی غلطی سے عہدہ آفریں تصنیف عہد آفریں تصنیف بن گئی ہے آپ کہیں گے عہدہ آفریں تصنیف کیا بلا ہے۔ بعض محکموں میں تقرر یا منصبی ترقی کے لیے صاحب تصنیف ہونا بڑا معاون ثابت ہوتا ہے۔ چنانچہ بعض لوگ صرف تقرر یا ترقی کے لئے ایک آدھ کتاب چھپوا کر مطلوبہ عہدہ حاصل کر لیتے ہیں۔ ممکن ہے آصف مجازی کو ایسی ہی ضرورت پیش آئی ہو۔ ان کی تصنیف سے ان پر کسی عہدے کا دروازہ کھل گیا ہے۔ لیکن اس قیاس آرائی سے ذہن مطمئن نہ ہو سکا۔ بھلا اگر کتابوں کے اشتہارات میں اتنی صداقت سے کام لیا جائے تو کیا وہ اشتہارات پڑھنے کے قابل رہیں گے؟

اشتہارات کی سب سے ضروری صفت یہی ہے کہ وہ دلچسپ ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ اشتہارات کو دلچسپ بنانے کے لئے اردو ناشرین وہ سب کچھ کر گذرتے ہیں جو نہ صرف ممکن ہے بلکہ مضحکہ خیز بھی۔ آپ نے اردو کے مشہور نقاد ریاضت سندیلوی (جنہیں میں طوالت سندیلوی کہنے کا عادی ہوں) کی کتابوں کے اشتہارات تو دیکھے ہوں گے خصوصاً وہ اشتہار جو حسب ذیل تھا۔

اردو کے سب سے کمسن لیکن نامور نقاد

ریاضت سندیلوی

کی

تیرھویں تصنیف

وغیرہ وغیرہ وغیرہ

معلوم نہیں اس اشتہار کو پڑھتے وقت آپ کا رد عمل کیا تھا۔ مجھے تو ایسا لگا جیسے کسی تنقیدی کتاب کا اشتہار نہیں پڑھ رہا ہوں بلکہ کسی فلم کا اشتہار دیکھ رہا ہوں جس میں ہیروئن کی پہلی خوبی اس کی کم سنی بتائی جاتی ہے اور بعض اوقات اسے بالی عمریا، پتلی کمریا، اور سانوری صورتیا کا مثالی نمونہ قرار دیا جاتا ہے۔ آپ کہیں گے کم سن کے لفظ نے میرے ذہن میں جس قسم کا تلازمِ خیال پیدا کیا۔

وہ دراصل اشتہار کا قصور نہیں بلکہ میری اپنی نفسیاتی یا فرائڈ کی اصطلاح میں جنسیاتی کمزوری ہے۔ چلئے اسے مانے لیتا ہوں۔ لیکن یہ بات اب بھی میری سمجھ میں نہیں آتی کہ تنقیدی تصنیف کے اشتہار میں تنقید نگار کی کم سنی کا حوالہ کیا ضرور خصوصاً جب کہ نقاد موصوف کچھ اتنے کم سن نہیں اور ان کی تصنیف کوئی بڑا کارنامہ نہیں۔ ابھی اس الجھن سے نجات نہیں ملی تھی کہ نقاد موصوف کی دوسری تصنیف نے مجھے دوسری الجھن میں مبتلا کردیا۔ ان کی دوسری تصنیف کے اشتہار کے ابتدائی جملے مختلف رسالوں میں حسب ذیل تھے:۔

(۱) دور جدید کے نامور نقاد اور اردو میں تخلیقی تنقید کے واحد علمبردار

(۲) اردو میں تخلیقی و تجرباتی تنقید کے بانی

(۳) برعظیم کے محقق نقاد اور تخلیقی تنقید کے باوا آدم

(۴) ریاضت سندیلوی

اس دور میں اردو زبان، اردو ادب اور کلچر کے سب سے بڑے پارکھ ہیں

ان اشتہارات کو پڑھ کر مجھے اپنی علمی کم مائگی پر رونا آگیا۔ لیکن قبل اس کے کہ میری آنکھوں میں آنسو آئیں میں نے تہیہ کرلیا کہ اب اپنے

ادبی معلومات میں اضافے کے لئے تنقیدی کتابیں پڑھنے کی بجائے صرف ان کے اشتہارات پڑھنے پر اکتفا کروں گا کیونکہ اتنے دنوں تک اردو نقادوں کی ساری تصانیف پڑھنے کے باوجود تخلیقی تنقید، تحقیقی تنقید اور تجرباتی تنقید کے واحد علمبردار اور اردو زبان و ادب اور کلچر کے سب سے بڑے پارکھ کا سراغ نہیں ملا تھا۔ اتنا ہی نہیں بلکہ بعض نقادوں کی تصانیف نے تو مجھے اس غلط فہمی میں بھی مبتلا کر رکھا تھا کہ اردو تنقید حالی سے شروع ہو کر حالی پر ختم ہو گئی یا یہ کہ اردو ادب میں لے دے کر ایک نقاد ہے حالی سو وہ بھی گیا۔ لیکن اشتہارات کے مطالعے سے اب پتا چلا کہ حالی کے بعد کم از کم ایک نقاد اور ضرور پیدا ہوا۔ اور وہ ہیں ریاضت سندیدی جن کی بدولت اردو ادب تنقید کے جملہ اقسام سے روشناس ہوا۔

کتابوں کے اشتہارات پڑھنے کا یہی فائدہ کچھ کم نہ تھا کہ ان کے ذریعہ سے نایاب قسم کی تنقیدی معلومات حاصل ہو جاتی تھیں۔ لیکن یہ دیکھ کر کہ اشتہارات کے پڑھنے میں وقت بہت کم لگتا ہے اور دماغ پر زور بالکل نہیں پڑتا میں نے کتابوں کا مطالعہ یک قلم ترک کر دیا اور صرف اشتہارات پر گذارہ کرنے لگا۔ لیکن اس

عادت کو زیادہ عرصہ نہیں گذرا تھا کہ مجھے اس کے غیر محفوظ ہونے کا احساس ہونے لگا۔ ایک دن پڑھے لکھے دوستوں کی صحبت میں یہ بحث چھڑ گئی کہ اقبال کے بعد اردو شعرا میں کسی کو عظیم شاعر کہا جا سکتا ہے یا نہیں۔ جب میں نے سب لوگوں کو اس فیصلے کی طرف بڑھتے دیکھا کہ اقبال کے بعد ابھی تک اردو میں کوئی عظیم شاعر پیدا نہیں ہوا تو میں نے رندانہ جرات کے ساتھ کہا۔ "مگر نفیس نمرو ہی کے بارے میں آپ لوگوں کا کیا خیال ہے؟" اتنا کہنا تھا کہ سب لوگ ہاتھ دھوئے بغیر میرے پیچھے پڑ گئے۔

"جی جی۔ کیا فرمایا آپ نے؟"

"نفیس نمرو ہی؟"

"یہ بھی کوئی شاعر ہیں؟"

"ارے صاحب شاعر ہی نہیں بلکہ ان (میری طرف اشارہ کرتے ہوئے) کے نزدیک عظیم شاعر ہیں۔ اقبال کے بعد دوسرے عظیم شاعر"

"ارے بھائی تمہارا دماغ تو نہیں چل گیا۔ تم تو بھلے ادبی گفتگو میں خاموش رہ کر اپنا بھرم قائم رکھتے تھے۔ آخر آج تمہیں ہو کیا گیا ہے؟"

اس ردعمل سے مجھے اندازہ ہوا کہ میں نے اشتہار پڑھ کر

نفیس نمرد آہی کے متعلق جو رائے قائم کرلی تھی اس کی صحت میں لوگوں کو اتنا شبہ نہیں جتنا اس رائے کے اظہار سے لوگوں کو میری دماغی صحت میں شبہ پیدا ہوگیا ہے۔ پھر بھی میں اپنے اشتہاری معلومات کو صحت اور صداقت سے بالکل خالی ماننے پر تیار نہ تھا۔ چنانچہ ایک دوسرے موقع پر میں پھر اپنے اشتہاری علم کا مظاہرہ کر گیا۔ بحث یہ تھی کہ آج کل اردو ادب پر جمود طاری ہے یا نہیں۔ اس باب میں احباب کی دو رائیں تھیں۔ جو لوگ یہ کہہ رہے تھے کہ اردو ادب پر جمود ہرگز طاری نہیں بلکہ جمود پر اردو ادب طاری ہے جس کا ثبوت یہ ہے کہ اردو ادب میں آئے دن اعلیٰ درجے کی تخلیقات پیش کی جارہی ہیں، ان کی حمایت کرتے ہوئے میں نے کہہ دیا کہ تعجب ہے جس دور میں آصف مجازی کی "کچھ آہیں کچھ دائیں"، جیسی عہد آفریں تصنیف معرض وجود میں آرہی ہو اسے جمود کا دور کیونکر کہا جاسکتا ہے۔ اس سوال پر سب لوگ ایک دوسرے کو سوالیہ نگاہ سے دیکھنے لگے۔ پھر یکے بعد دیگر مسکرانے لگے۔ آخر کار حامد حسن بولے۔ یار! یہ بصیرت افروز باتیں تمہیں کہاں سے ہاتھ لگتی ہیں؟" ابھی میں اس سوال جواب کا نہ دینے پایا تھا کہ ہدایت علی خاں سرپرستانہ انداز میں کہنے لگے۔ "نہ میری مانو تو ایک بات کہوں۔ اگر تم واقعی کچھ سیکھنا چاہتے ہو تو کتابیں

پڑھاکرو کتابیں۔ کتابیں پڑھنے سے علم میں اضافہ ہوتا ہے اور اشتہار پڑھنے سے جہالت میں۔" ہدایت علی خاں کے آخری جملے پر سب لوگ ہنس پڑے۔ میں سمجھ گیا کہ ہدایت علی خاں میرے علم کے ماخذ سے واقف ہیں اور اس ماخذ کے سہارے ادبی گفتگو میں حصہ لینا اپنی عزت آبرو کو خطرے میں ڈالنے کے برابر ہے۔ چنانچہ اس روز میں نے تہیہ کر لیا کہ اب جب تک چار پانچ کتابیں اور پانچ چھ مضامین نہ پڑھ لوں ادبی گفتگو میں ہرگز ٹانگ نہ اڑاؤں گا۔

کچھ عرصے کے بعد پھر مجھے ایک ادبی گفتگو میں شریک ہونے کا موقع مل گیا۔ موضوع سخن یہ تھا کہ اردو ادب کسی بھی صنف میں انگریزی ادب کا ہمسر قرار دیا جا سکتا ہے یا نہیں۔ بقراطوں کا خیال یہ تھا کہ ابھی تک اردو ادب کسی بھی صنف میں انگریزی ادب کی ہمسری کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ اس مسئلے کے متعلق میری اپنی کوئی رائے نہ تھی۔ دراصل کسی بھی مسئلے کے متعلق میری اپنی کوئی رائے نہیں ہے کیونکہ میں نقاد نہیں قاری ہوں۔ جس ملک میں خود نقادوں کے پاس اپنی رائیں نہ ہوں وہاں قارئین کے پاس اپنی رائیں کیونکر ہو سکتی ہیں۔ لیکن اتفاق سے ادھر جو مضامین اور کتابیں میں نے پڑھی تھیں ان کا میرے ذہن پر تاثر یہ تھا کہ اردو ادب کئی صنفوں میں

انگریزی ادب بلکہ مغربی ادب کا مد مقابل قرار دیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ میں نے اپنے حالیہ مطالعے کے بل بوتے پر زیر بحث مسئلے کے متعلق اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ آپ لوگ خواہ مخواہ احساس کمتری میں مبتلا معلوم ہوتے ہیں۔ اردو ادب ایک صنف میں کیا، کئی صنفوں میں انگریزی ادب کا ہمسر قرار دیا جا سکتا ہے بلکہ ایک اعتبار سے اسے برتر قرار دینا بھی بیجا نہ ہوگا۔ انگریزی ادب میں صرف ایک شیکسپیر گذرا ہے۔ اس کے برعکس اردو ادب میں چار شیکسپیر گذرے۔ مرزا رفیع سودا۔ نظیر اکبر آبادی، میر انیس اور آغا حشر۔ اگر سودا۔ نظیر۔ اور انیس اپنی شاعری کے اعتبار سے اردو کے شیکسپیر ہیں تو آغا حشر ڈرامانگاری کے اعتبار سے۔ اسی طرح انگریزی شاعری نے صرف ایک کیٹس پیدا کیا ہے۔ اردو شاعری نے کئی کیٹس پیدا کئے ہیں۔ مثلاً اختر شیرانی، جوش ملیح آبادی اور اسرار الحق مجاز۔ افسانہ نگاری میں سعادت حسن منٹو یقیناً اردو کا موپساں ہے اور تنقید نگاری میں آل احمد سرور اردو کے ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ۔ ان نابغہ شخصیتوں کے ہوتے ہوئے اردو ادب کو انگریزی ادب کا ہمسر تسلیم نہ کرنا عجیب سی بات ہے۔

میرے ان خیالات بلکہ ان الفاظ کو سنتے ہی ایک صاحب

نے مسکراتے ہوئے یہ مصرع پڑھا ع۔ جو بات کی خدا کی قسم لاجواب کی
ایک دوسرے صاحب نے فرمایا۔ مجھے آپ کی رائے سے پورا اتفاق
ہے بلکہ میرا تو خیال ہے کہ اب یہ کہنے کی بجائے کہ آغا حشر اردو
کے شیکسپیر یا آل احمد سرور اردو کے ٹی ایس ایلیٹ ہیں یہ کہنا
زیادہ موزوں ہوگا کہ شیکسپیر انگریزی کا آغا حشر تھا اور ٹی ایس ایلیٹ
انگریزی کے آل احمد سرور ہیں کیونکہ آغا حشر کو اردو کا شیکسپیر یا
آل احمد سرور کو اردو کا ٹی ایس ایلیٹ کہنا ایسا ہی ہے جیسے
شیکسپیر کو انگریزی کا آغا حشر اور ایلیٹ کو انگریزی کا آل احمد
سرور کہنا۔ ان جملوں پر تمام حاضرین بے اختیار ہنس پڑے جس کی
بنا پر مجھے یہ شبہ پیدا ہوا کہ لوگ میری رائے کا مضحکہ اڑا رہے
ہیں۔ اس شبہ کی تصدیق یوں ہوگئی کہ میرے پرانے کرم فرما
ہدایت علی خاں نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "ارے یار اسی
روز تم سے کہہ چکا ہوں کہ اگر کچھ سیکھنا چاہتے ہو تو کتابیں پڑھا
کرو کتابیں۔ کتابیں پڑھنے سے علم میں اضافہ ہوتا ہے اور
اشتہارات پڑھنے سے جہالت میں" اُس دن تو مجھے ان کا
یہ مشورہ ناگوار نہیں گذرا تھا کیونکہ اُس دن میں واقعی اپنے
اشتہاری علم کے بل بوتے پر گفتگو کر رہا تھا لیکن اب کی بار

یہ مشورہ سننے کو ہرگز تیار نہ تھا کیونکہ اس دفعہ میں تنقیدی مضامین اور تنقیدی کتابیں پڑھ کر اظہارِ خیال کر رہا تھا۔ خیر ان کے مشورے سے جو کوفت ہوئی سو ہوئی لیکن اب میری الجھن صرف یہ نہیں کہ اردو کتابوں کے اشتہار کو اشتہار سمجھوں یا انکشاف۔ اب میری الجھن یہ بھی ہے کہ اردو کے انتقادی ادب کو انتقادی ادب سمجھوں یا اشتہاری بکواس۔ اگر آپ اس پریشانی میں مبتلا نہ ہوں تو للہ میری مدد کیجیے۔

۱۲ر جنوری سنہ ۱۹۶۱ء

شادی

لوگ اکثر مجھ سے دریافت کرتے ہیں کہ آپ شادی کب کریں گے۔ اس سوال کے جواب میں میں بھی ان سے ہمیشہ پوچھتا رہا ہوں کہ آپ نے شادی کیوں کی تھی۔ اس قسم کے سوال و جواب سے میرے دل میں یہ بات بیٹھ گئی ہے کہ شادی شدہ اور غیر شادی شدہ آدمیوں میں وہی فرق ہے جو کیوں اور کب میں ہے۔ یعنی شادی شدہ لوگ وہ ہیں جو یہ نہیں بتا سکتے کہ انہوں نے شادی کرنے کی حماقت کیوں کی تھی اور غیر شادی شدہ لوگ وہ ہیں جو یہ

نہیں جانتے یا جن سے برابر یہ دریافت کیا جاتا ہے کہ وہ شادی کرنے کی حماقت میں کب مبتلا ہوں گے۔ ممکن ہے شادی کے لیے لفظ حماقت کا استعمال شادی شدہ اور غیر شادی شدہ دونوں قسم کے لوگوں کو یکساں طور پر ناگوار گذر رہا ہو۔ شادی شدہ لوگوں کو اس لئے کہ شادی کو حماقت مان لینے سے ان کے نام احمقوں کی فہرست میں درج ہو جاتے ہیں اور غیر شادی شدہ لوگوں کو اس لئے کہ وہ شادی کو حماقت کی بجائے زندگی کا حسین فرض سمجھے بیٹھے ہیں۔ لیکن اس کا کیا علاج کہ شادی اگر حماقت نہیں تو شامت ضرور ہے۔

شادی انسان کی ان شامتوں میں سے ہے جن سے بچنا محال اور نہ بچنا مہلک ہے۔ یہ بات شوہر کے نقطۂ نظر سے بھی اتنی ہی درست ہے جتنی بیوی کے نقطۂ نظر سے۔ یہ احساس صرف شوہروں کا حصہ نہیں کہ ایک ایک عدد بیوی ان کے گلے آ پڑی ہے بلکہ بیویاں بھی اسے اپنی شامت اعمال سمجھتی ہیں کہ ایک ایک عدد شوہر ان کے سر منڈھ دیا گیا ہے جو اپنی نظر میں خلاصۂ کائنات ہی کیوں نہ ہو لیکن بیوی کی نگاہ میں گھر کے سب سے ناقص اور نکمے فرد کی حیثیت رکھتا ہے۔ کتنی عجیب بات ہے کہ ہر بیوی کو دوسروں کے شوہر ذہین اور ہر شوہر کو دوسروں کی بیویاں حسین معلوم ہوتی ہیں۔

جب سے میں نے اپنے اس ارادے کا اعلان کیا ہے کہ میں
شادی اس وقت کروں گا جب نہ صرف میری بلکہ ملک بھر کی عام
اقتصادی حالت درست ہو جائے گی میرے احباب اور اعزہ سخت
تردد اور پریشانی میں مبتلا نظر آتے ہیں وہ اپنے ذہن و فکر کی تمام
قوتیں اس بات پر صرف کرتے رہے ہیں کہ میں اپنے اس قومی مگر
غیر انسانی ارادے سے باز آجاؤں۔ وہ مجھے شادی کی ترغیب دینے
کے لیے ہر قسم کی منطق سے کام لیتے رہے ہیں اور شادی کے ایسے ایسے
فوائد بیان کرتے رہے ہیں جو اب تک خود ان کے تجربے میں نہیں آئے
اور نہ آئندہ آئیں گے۔ جب سے انہوں نے یہ محسوس کیا ہے کہ میں شادی
کے فوائد سے متاثر نہیں ہوتا انہوں نے مجھے ان نقصانات کا احساس
دلانے کی کوشش شروع کر دی ہے جو شادی نہ کرنے کی وجہ سے مجھے
پہنچ رہے ہیں۔ مثلاً میں اکثر تنہائی اور بے کیفی کا رونا روتا رہتا ہوں۔
اب جب کبھی میری زبان سے تنہائی اور بے کیفی کی شکایت نکلتی
ہے احباب اور اقربا کہنے لگتے ہیں دیکھو ہم اسی لیے کہتے ہیں کہ شادی
کرلو۔ شادی کا کم از کم اتنا تو فائدہ ہے کہ آدمی تنہائی اور بے کیفی
محسوس نہیں کرتا۔ دل بہلانے کے لیے بیوی بہترین ذریعہ ہے۔ بیوی
سے بہتر کوئی تفریح نہیں۔ جب یہ بات سنتے سنتے ناک میں آگیا تو میں نے

کہنا پڑا کہ ممکن ہے بیوی سے بہتر تفریح کوئی نہ ہو۔ لیکن آپ بھول جاتے ہیں کہ بیوی سے تفریح کا نتیجہ بچوں کی پیدائش کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ اور میں شوہر بننے سے اتنا نہیں گھبراتا جتنا باپ بننے سے۔

جہاں تک اولاد کا تعلق ہے وہ بہرحال ایک مصیبت کی حیثیت رکھتی ہے۔ یعنی اولاد کثرت سے پیدا ہو جب بھی اور اگر بالکل نہ پیدا ہو جب بھی۔ اولاد کثرت سے پیدا ہو تو آدمی کی اقتصادی حیثیت پر ضرب پڑتی ہے اور اگر بالکل نہ پیدا ہو تو آدمی کی آبرو خطرے میں پڑ جاتی ہے۔ وہ یوں کہ ممکن ہے کہ اولاد کے پیدا نہ ہونے کی ذمہ داری بیوی پر ہو لیکن بدنامی شوہر ہی کے حصے میں آتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مجھے ناکام شوہر سمجھے جانے سے نامراد عاشق کہلانا بہتر معلوم ہوتا ہے۔

شادی کے معاملے میں نوجوانوں اور بوڑھوں کا نقطۂ نظر ہمیشہ ایک دوسرے سے برسرپیکار رہا ہے۔ نوجوان ہمیشہ اس بات کے قائل رہے ہیں کہ شادی اس سے کرنی چاہیے جس سے محبت رہ چکی ہو اور بوڑھے ہمیشہ اس پر اصرار کرتے آئے ہیں کہ محبت اس سے کرنی چاہیے جس سے شادی ہو چکی ہو۔ نوجوانوں

کا طرزِ عمل یہ رہا ہے کہ محبت محبوبہ سے ہونی چاہیے خواہ محبوبہ جیسی بھی ہو۔ بوڑھوں کا پیغام عمل یہ رہا ہے کہ محبت منکوحہ سے ہونی چاہیئے خواہ منکوحہ جیسی بھی ہو۔ ان دونوں کے انداز نظر میں فرق صرف اتنا ہے کہ بوڑھے شادی کو فرض کا درجہ دیتے ہیں اور نوجوان اسے فن تصور کرتے ہیں اور اس فن کے برتنے میں وہ تمام غلطیاں کرنا چاہتے ہیں جن کا ایک مبتدی فنکار سے سرزد ہونا نہ صرف متوقع ہے بلکہ ناگزیر بھی۔

شادی کو فن کی حیثیت سے برتنے کی صورت یہی ہے کہ پہلے محبت کی جائے پھر اس کے بعد شادی۔ یعنی محبت کے راستے سے شادی کی منزل تک پہنچنے کی کوشش کی جائے۔ اس معاملے میں نوجوانوں سے جو عام غلطی ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ وہ نہ محبت کرتے وقت کچھ سوچتے ہیں نہ شادی کرتے وقت۔ لیکن بعد میں پچھتاتے دونوں پر ہیں۔ محبت پر اس لیے کہ غلط قسم کی لڑکی کو محبوبہ بنا لیا اور شادی پر اس لیے کہ غلط قسم کی محبوبہ کو منکوحہ میں تبدیل کر لیا۔ نوجوانوں کا پہلا جذبہ یہ ہوتا ہے کہ جو لڑکی بھی سامنے آئے اس سے محبت کر لو اور دوسرا یہ کہ جو لڑکی بھی محبت کرنے پر آمادہ ہو اس سے شادی کر لو۔ اس جلد بازی میں نہ محبوبہ اچھی

ملتی ہے نہ بیوی۔ شادی کو فن کی حیثیت سے برتنے میں سب سے بڑی خرابی یہی ہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ خوب سے خوب تر محبوبہ یا بیوی کی تلاش میں آدمی نہ محبت کرے نہ شادی۔ بقول میر ع ایسا کچھ کر کے چلو یاں کہ بہت یاد رہو۔ بعض مفسرین کے نزدیک اس مصرعے کا ایک مفہوم یہ بھی ہے کہ اگر زمانے کے لیے مثال نہ بن سکو تو عبرت ہی بن جاؤ۔

نوجوان شادی کو فن تصور کرنے میں حق بجانب ہوں یا نہیں مگر بوڑھے لوگ شادی کو فرض تصور کرنے میں ہرگز حق بجانب نظر نہیں آتے خصوصاً اس لیے کہ وہ شادی کو نوجوانوں کا فرض کم اور اپنا فرض زیادہ سمجھتے ہیں۔ اسی بنا پر قدیم زمانے سے ہمارے یہاں یہ دستور چلا آرہا ہے کہ شادی کے معاملے میں والدین نہ لڑکے سے کچھ مشورہ کرتے ہیں نہ لڑکی سے۔ اور جب جی چاہا، جہاں جی چاہا، جس سے جی چاہا، لڑکے یا لڑکی کی شادی کر کے اپنے فرض سے سبکدوش ہو لیتے ہیں۔ موجودہ صدی میں خصوصاً پچیس تیس سال سے نوجوان، بوڑھوں کے اس رویے کے خلاف احتجاج بھی کرتے رہے ہیں اور بغاوت بھی۔ احتجاج کے لیے وہ اپنی محبوبہ یا منظورِ نظر کے نام اس قسم کے شعر کہتے رہے ہیں کہ ؎

تم میں ہمت ہے تو دنیا سے بغاوت کر دو
ورنہ ماں باپ جہاں کہتے ہیں شادی کر لو

اگر اس قسم کے احتجاج سے کام نہیں چلتا تو بغاوت کے طور پر سول میرج (Civil Marriage) کر لیتے ہیں۔ اس احتجاج اور بغاوت کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ ایک طرف والدین کی نظر میں ترقی پسند شاعری اور مغربی تمدن دونوں رسوا ہوئے ہیں۔ دوسری طرف بوڑھوں اور نوجوانوں کے درمیان سول میرج کی بدولت سول وار شروع ہو گئی ہے۔

شادی کے ساتھ خانہ آبادی کے الفاظ روایتی طور پر استعمال ہوتے چلے آئے ہیں۔ لیکن اس بات کی تحقیق آج تک نہ ہوئی کہ شادی سے گھر واقعی آباد ہوتے بھی ہیں یا نہیں۔ اگر گھر کے افراد کی تعداد میں اضافے کے معنی خانہ آبادی کے ہیں تو یقیناً شادی سے گھر آباد ہوتا ہے۔ لیکن مشاہدہ بتاتا ہے کہ گھر کے افراد کی تعداد جتنی بڑھتی جاتی ہے افراد کی سہولتیں اور مسرتیں اتنی ہی کم ہوتی جاتی ہیں۔ یہاں تک کہ گھر کی بڑھتی ہوئی آبادی ہی گھر کی بربادی کا سبب بن جاتی ہے۔ اب تو ماہرینِ عمرانیات کا خیال ہے کہ دنیا کو جتنا خطرہ سائنس کی ترقی سے نہیں، اتنا آبادی کی ترقی سے ہے۔ اس پیشین گوئی نے شادی شدہ لوگوں کو عجیب مخمصے میں

ڈال دیا ہے۔ یعنی انسانیت کے بہی خواہوں کی طرف سے ان کے نام پہ اپیل اور حکومتوں کی طرف سے یہ آئین شائع ہونے لگا ہے کہ شادی کے باوجود بچے نہ پیدا کرو یا ایک دو بچوں پہ اکتفا کرو۔ یہ اپیل اور یہ آئین ان کی انفرادی آزادی میں اتنا خلل انداز ہوتا نظر نہیں آتا جتنا ان کے مذہب میں دخل دیتا نظر آتا ہے۔ مذہب کے ماننے والوں کے لیے یہ مسئلہ اتنا اہم نہیں کہ برتھ کنٹرول نہ ہونے سے انسانیت کو کیا کچھ نقصان پہنچ رہا ہے جتنا یہ مسئلہ کہ برتھ کنٹرول کے لیے اپیل شائع کرنے اور آئین نافذ کرنے سے ان کے مذہب کو کتنا نقصان پہنچ رہا ہے۔ مذہب کے ٹھیکیداروں کے لیے "خدائی فوجدار" بننے کا اس سے بہتر موقع اور کیا ہو سکتا تھا۔

بعض فلسفیوں کا خیال ہے کہ محبت ہر ایک سے کی جا سکتی ہے سوائے بیوی کے۔ یعنی بیوی سب کچھ ہو سکتی ہے بجز محبوبہ کے۔ مگر اس خیال میں ہر فلسفیانہ خیال کی طرح فلسفے کا عنصر زیادہ اور تجربے کا عنصر کم ہے۔ انسانی تجربات اور جرائم سے متعلق اخباروں کے صفحات شاہد ہیں کہ بیوی محبوبہ بھی بن سکتی ہے۔ اگر اپنے شوہر کی نہیں تو دوسروں کی سہی۔ جب کبھی کوئی بیوی کسی اور کی محبوبہ بن جاتی ہے تو اس کا شوہر اس واقعے یا حادثے کو خاندان کی ناک کٹ جانے سے تعبیر کرتا ہے اور خاندان کی کٹی ہوئی ناک کی تلافی کے لیے اپنی بیوی کے عاشق کی گردن کاٹ

غالباً ہے جب تک خاندان کی ناک انسان کی گردن سے زیادہ اہم سمجھی جائے گی اس قسم کے حادثات ہوتے رہیں گے۔ اس قسم کے حادثات کو روکنے کی واحد صورت یہ ہے کہ خاندانی عزو وقار کے تصور میں ترمیم کی جائے یعنی یہ بات سمجھنے کی کوشش کی جائے کہ محبت ایک جذبۂ بے اختیار ہے۔ اس بنا پر اگر ایک شوہر کو کسی کی بیوی سے یا ایک بیوی کو کسی کے شوہر سے محبت ہو جائے تو اس جذباتی مجبوری کو خاندانی عزو وقار کے منافی تصور نہ کیا جائے۔ ایسی صورت میں دونوں (عاشق اور محبوبہ) کو مجبور سمجھ کر معاف کر دینا چاہیئے بلکہ دونوں کی از سر نو شادی کر کے دونوں کی مسرت میں اضافہ کرنا چاہیئے۔ آخر بازوؤں کے بل پر ایسی بیوی کا شوہر بنے رہنے سے کیا فائدہ جس کا جسم تو آپ کے پاس ہو اور دل کہیں اور۔ یا خاندان کی کٹی ہوئی ناک کی ایسی تلافی سے کیا حاصل جس میں آپ کی بیوی کے عاشق کی گردن آپ کے ہاتھ کٹے اور آپ کی گردن حکومت کے ہاتھ۔

شادی کا ادارہ انسان اور انسانی معاشرے کے بہت سے مسائل کو حل کرنے کے لیے وجود میں آیا تھا۔ معلوم نہیں اس نے وہ مسائل حل کئے یا نہیں۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ اس نے بہت سے مسائل پیدا کر دیئے ہیں۔ اسی لئے بعض لوگ اس ادارے کو ناقص اور نقصان دہ قرار دے

کر اس کو یک قلم ختم کر دینے کے حامی بن گئے ہیں۔ ذاتی طور پر مجرد رہنے کے باوجود میں ایسے لوگوں کا مخالف رہا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ انسان کو ہمیشہ اپنے مسائل میں برے حل اور بدتر حل کے درمیان انتخاب کرنا پڑا ہے۔ شادی کے معاملے میں بھی اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ بد کو بدتر پر ترجیح دی جائے۔ یعنی یہ مان لیا جائے کہ شادی کی رسم یا شادی کا ادارہ ہزار برا سہی۔ لیکن اس کا نہ ہونا اور برا ثابت ہوگا۔ کسی کا شعر ہے ؎

وہی کٹی ہوئی نیندیں، وہی فسردہ دلی
میں سوچتا ہوں کہ سب کچھ لٹا کے کیا پایا

ممکن ہے محبت کر کے یہی دو چیزیں ہاتھ آتی ہوں۔ شادی کر کے بھی دو ہی چیزیں ہاتھ آتی ہیں لیکن وہ کٹی ہوئی نیندوں اور فسردہ دلی سے مختلف اور بہتر ہوتی ہیں۔ میری مراد جہیز اور بیوی سے ہے۔ جہیز اور بیوی میں جس کی جتنی اہمیت پہلے تھی اتنی ہی اب بھی ہے۔ یعنی شادی کے صلے میں بیوی کی حیثیت پہلے بھی ثانوی تھی اور اب بھی ثانوی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اگلے زمانے کے لوگ شادی کے صلے میں غیر معمولی جہیز کے آرزومند رہا کرتے تھے اور اب لوگ اس کے لئے اصرار بھی کرنے لگے ہیں۔ آج کل شادی کرنے والے سے

لے کر اس کے والدین تک جہیز سے جس شدید لیکن غیر شائستہ دلچسپی کا اظہار کرتے ہیں اس نے شادی کو سوداگری بنا کر رکھ دیا ہے۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شادی جہیز کے لئے کی جاتی ہے نہ کہ بیوی کے لئے۔ اس صورت حال کو دیکھتے دیکھتے مجھے فرائڈ کے اس نظریے کی صحت میں بھی شبہ پیدا ہو گیا ہے کہ انسان کے افعال و اعمال کا سرچشمہ اس کے جنسی میلانات ہیں۔ بیوی کی بہ نسبت جہیز سے غیر معمولی دلچسپی اگر فرائڈ کے نظریے کی مکمل نفی نہیں کرتی تو جزوی تردید ضرور کرتی ہے۔ اگر فرائڈ کا نظریہ سو فیصدی صحیح ہوتا تو جو چیزیں حاصل شادی ہیں ان میں بیوی سرِ فہرست ہوتی لیکن مجھے یقین ہے کہ اگر آپ کسی شادی کرنے والے سے پوچھیں کہ شادی کے صلے میں کیا کچھ چاہتے ہو تو وہ جواب میں کچھ اس قسم کی فہرست پیش کرے گا۔

(۱) سلامی دو ہزار روپیہ

(۲) جدید طرز کا آراستہ مکان ایک عدد

(۳) فرنیچر ایک سٹ

(۴) اعلیٰ تعلیم کے لئے لندن یا امریکا جانے کا خرچ

(۵) کار ایک عدد (۶) ریڈیو ایک عدد

(۷) ریڈیوگرام ایک عدد (۸) گرم سوٹ ۴ عدد

(۹) ٹھنڈا سوٹ ۴ عدد (۱۰) گرم شیروانی ۲ عدد

(۱۱) ٹھنڈی شیروانی ۲ عدد (۱۲) پارکر ۵۱ ۔ ایک عدد

(۱۳) رسٹ واچ ایک عدد (۱۴) بیوی ایک عدد

جیسا کہ اس فہرست سے ظاہر ہے شادی سے ہاتھ آنے والی چیزوں میں بیوی آخری جزو کی حیثیت رکھتی ہے کیا عجب کہ ایک زمانہ ایسا بھی آجائے جب اس قسم کی فہرست میں بیوی کہیں بھی نہ آنے پائے۔

انگریزی میں ایک مثل ہے کہ اعتماد سے اعتماد پیدا ہوتا ہے۔ بہت سے لوگ اعتراف سے اعتماد پیدا کرتے ہیں اور خاصے کامیاب رہتے ہیں۔ وہ یوں کہ لوگ اپنی بیویوں سے اپنے سابقہ معاشقوں کا اعتراف کر لیتے ہیں بلکہ سابقہ معشوقوں کے خطوط تک اپنی بیوی کے حوالے کر دیتے ہیں کہ جی چاہے تو انہیں رکھو اور جی چاہے تو جلا دو۔ بیوی سے اس قسم کے اعتراف کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ شادی سے پہلے میرا کردار عاشقانہ رہا ہے۔ اب شوہرانہ رہے گا۔ بالفاظ دیگر پہلے میرا سروکار مسلسل عاشقی سے تھا اب تدریجی خودکشی سے رہے گا۔ سنا ہے کہ اس قسم کے اعتراف واقرار کے بعد بیوی کا دل ہمیشہ کے لئے مطمئن ہو جاتا ہے چاہے شوہر زن مرید ہو یا نہ ہو۔

بیویاں شوہروں کے کردار کا جتنا بھی احتساب کریں مگر واقعہ یہ ہے کہ کردار کے احتساب کا تعلق ہر زمانے اور ہر سماج میں مردوں

سے زیادہ عورتوں ہی سے رہا ہے۔ مرد اپنے کردار کے لئے زیادہ سے زیادہ بیوی کے سامنے جوابدہ ہوتے ہیں۔ عورتیں اپنے کردار کے لئے پورے سماج کے سامنے جواب دہ ہوتی ہیں۔ سوسائٹی مردوں کے گناہوں سے اغماض بھی کر لیتی ہے لیکن عورتوں کی لغزشوں کو کبھی معاف نہیں کرتی۔ ایک مدت سے عورت مرد کے مساوی حقوق کے نعرے سننے میں آرہے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ عورت اور مرد کے حقوق مساوی اس دن ہوں گے جس دن عورتوں کو بھی مردوں کے برابر گناہ میں حصے لینے یا گناہوں میں حصہ لینے کے باوجود سماج کی زد سے محفوظ رہنا نصیب ہوگا۔ جب تک ایسا نہیں ہوتا شادی کے معاملے میں لڑکی اور لڑکے کی اچھائی کا معیار صرف یہ ہوگا کہ لڑکی کا ماضی بے داغ ہو اور لڑکے کا مستقبل روشن۔

۲۴ جنوری ۱۹۵۹ء

بیسویں صدی

(بیالیسویں صدی کے نقطۂ نظر سے)

بیسویں صدی انسانی تاریخ کے اُس دور کا نام ہے جو انیسویں صدی کے بعد اور اکیسویں صدی سے پہلے گذرا تھا۔ یہ دور اس لحاظ سے ناقابلِ فراموش ہے کہ اس میں زندگی کے سارے تضاد پایۂ تکمیل تک پہنچ گئے تھے۔ تعمیر اور تخریب، حکمت اور حماقت، تہذیب اور تباہی کی تمام قوتوں نے اپنی آخری جنگ۔۔ اسی دور میں لڑی تھی۔ انسان نے جس قدر ذہانت سے کام لے کر ہلاکت آفریں حربے ایجاد کئے تھے اتنی ہی حماقت سے کام لے کر ان حربوں کو اپنے اوپر استعمال کر ڈالا تھا

جس جنگ میں وہ حربے استعمال کئے گئے تھے وہ بیسویں صدی کی تیسری عظیم جنگ تھی۔ برٹرنڈ رسل جیسے انسانیت پرست فلسفی نے انسانوں کو ان تباہ کن حربوں کی تیاری سے باز رکھنے اور تیار شدہ حربوں کو ضائع کر دینے پر آمادہ کرنے کی ہر ممکن کوشش کی لیکن اس کے مخالفوں نے اس کوشش کو بزدلی سے تعبیر کیا۔ رسل اور اس کے مخالفین کے درمیان برسوں اخبارات میں بحث چلتی رہی۔ چونکہ انسان ہمیشہ مفید مشوروں سے متنفر رہا ہے اس لئے بیسویں صدی والوں نے رسل کے مخالفین ہی کے نقطۂ نظر پر عمل کیا۔ انجام وہی ہوا جس کی پیشین گوئی کی جا چکی تھی۔ یعنی ایٹمی ہتھیاروں کے استعمال نے صفحۂ ہستی سے انسانوں کا صفایا کر ڈالا۔ اب اگر یہ مان لیا جائے کہ بیسویں صدی والوں نے یہ خودکشی اپنی بہادری کا ثبوت دینے کے لئے کی تھی اور یہ بھی تسلیم کر لیا جائے کہ انہوں نے خودکشی کے ذریعے سے اصولی اور اخلاقی بہادری کا ثبوت دیا جب بھی اس میں کیا شبہ کہ بہادری اور بیوقوفی ایک ہی عمل یا طرز عمل کے دو نام ہیں؟

بیسویں صدی کو زمانہ عظیم مسائل و مصائب کا زمانہ تھا۔ اس صدی کے لوگ دو عظیم جنگوں سے گذرنے کے بعد کچھ عرصے تک تیسری عظیم جنگ سے بچنے کی کوشش کرتے رہے۔ اس کوشش کو کامیاب بنانے کے لئے نوبل پیس پرائز جیسا عظیم انعام بھی مقرر کر دیا گیا تھا۔ کچھ لوگ اس انعام کے حاصل کرنے میں تو کامیاب ہو گئے لیکن بین الاقوامی امن قائم کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے جس کی ایک اہم وجہ یہ تھی کہ دو عظیم جنگوں کے بعد بڑی قوموں نے تیسری جنگ کی تیاری کو اپنی سب سے بڑی صنعت بنا لیا تھا اور اپنے صنعتی مال کو کھپانے کے لئے چھوٹی

قوموں کے ممالک میں مقامی جنگ (Local war or situation) چھیڑ رکھی تھی۔ بڑی قوموں کا نظریہ یہ تھا کہ اپنی خلائی صحت کے لیے صلح و آشتی کی کوشش بھی ضروری ہے اور اپنی صنعت کو فروغ دینے کے لیے جنگ و جدل بھی۔ چنانچہ صلح و آشتی کی لاج رکھنے کے لیے لیگ آف نیشنز اور یو۔ این۔ او جیسے ادارے بھی وجود میں آ گئے تھے اور جنگ و جدل کا بازار گرم رکھنے کے لیے کاشمیر، کوریا، ہنگری، سوئز، الجیریا، ہند چینی، کانگو اور لاؤس کے آتش فشانی مسائل بھی وقتاً فوقتاً بروئے کار لائے جاتے تھے۔ وہ یوں کہ پہلے ان مسائل پر سرد جنگ لڑی جاتی تھی جس کا خاتمہ عموماً گرم جنگ پر ہوا کرتا تھا۔

بیسویں صدی میں بیشتر قومیں دوسری قوموں کی خونریزیوں پر خون کے آنسو روتی تھیں اور اپنی قاتلانہ سرگرمیوں کو اپنے ملک کا اندرونی معاملہ کہہ کر احتجاج کے خلاف احتجاج کرتی تھیں۔ اس دور میں بڑی قوموں اور چھوٹی قوموں کے درمیان محافظ اور محفوظ کا رشتہ اتنا نہ تھا جتنا ظالم اور مظلوم یا قاتل اور مقتول کا۔

بیسویں صدی میں ہر انفرادی معاملہ کسی نہ کسی طور پر اجتماعی مسائل سے منسلک ہو گیا تھا جس کا نتیجہ یہ تھا کہ ہر آدمی نہ صرف اپنے لئے ایک مسئلہ تھا بلکہ اپنے معاشرے کے لئے بھی۔ اور چونکہ اجتماعیت کا دائرہ وسیع تر ہوتا چلا گیا اس لئے ہر آدمی نہ صرف اپنے معاشرے کے لئے ایک مسئلہ بن گیا بلکہ ہر معاشرہ اپنی حکومت کے لئے اور ہر حکومت یو۔ این۔ او کے لئے ایک مسئلہ بن گئی۔ آپ جانتے ہیں دو ملاؤں میں مرغی حرام ہو جاتی ہے۔ یو۔ این۔ او میں اسی سے زیادہ قوموں کے نمائندے موجود رہا کرتے تھے۔ اتنے نمائندوں کے درمیان کسی ملک کا مسئلہ معمہ کیوں نہ بن جاتا۔

چنانچہ وہاں جو مسئلہ کبھی آتا سلجھنے کی بجائے اور الجھتا جاتا۔ واقعہ یہ ہے کہ یو۔این۔او کی حیثیت بین الاقوامی پنچایت سے زیادہ بین الاقوامی انجمن مباحثہ (ڈبیٹنگ کلب) کی تھی یا پھر ایسے بزم مشاعرہ کی جس میں مختلف ممالک کے مسائل مصرع طرح کا کام دیتے تھے۔ بعض اوقات یو۔این۔او سے مایوس ہو کر دو مخالف قوموں کے وزراء اعظم ایک دوسرے سے مل کر اپنے مسائل طے کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ مگر اس قسم کی ملاقات و مذاکرت کے بعد جو کمیونکے شائع ہوتا تھا اس میں عموماً یہ لکھا ہوتا تھا کہ دونوں ملکوں کے وزراء اعظم نے باہمی مسائل پر چھ گھنٹے تک گفتگو کی۔ اگرچہ وہ کسی نتیجے تک نہ پہنچ سکے لیکن اس بات پر دونوں متفق ہیں کہ آپس کے مسائل کو جنگ کے ذریعے سے طے کرنا دونوں ملکوں کے لئے مضر ثابت ہوگا۔ اس قسم کے کمیونکے کو پڑھتے وقت ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے بیسویں صدی میں دو مخالف ملکوں کے وزراء اعظم کو ملاقات و مذاکرات سے پہلے اس پر بھی اتفاق نہ تھا کہ جنگ فریقین کے لئے مضر ثابت ہوگی۔

یوں تو کہنے کو بیسویں صدی ترقی پسندی اور روشن خیالی کی انتہائی منزل تک جا پہنچی تھی پھر بھی انسانی تاریخ کا یہ عظیم الشان دور مذہبی تعصب اور رنگ و نسل کی تفریق سے خالی نہ تھا جس کا ثبوت یہ ہے کہ اس دور میں مذہب، رنگ اور نسل کی بنیاد پر بعض ممالک میں ہولناک فسادات رونما ہوتے رہتے تھے۔ عام طور پر نسلی تفریق مذہبی تعصب سے بھی زیادہ بری چیز سمجھی جاتی تھی۔ نسلی تفریق کا سب سے بڑا حامی جنوبی افریقہ تھا جس نے اس پالیسی کی خاطر کومن ویلیتھ سے علحدگی منظور کر لی لیکن اس پالیسی کو ترک کرنا گوارا نہ کیا۔ اس مسئلے کے متعلق

جنوبی افریقا کے ہمدردوں کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ یہ جنوبی افریقا کا اندرونی معاملہ ہے جس میں بیرونی حکومتوں کو کوئی دخل نہ دینا چاہیئے۔ کومن ویلتھ سے علحدگی پر جنوبی افریقا کے وزیراعظم نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا تھا کہ ہم نے وہی کیا جو خدا چاہتا تھا۔ یعنی خدا یہ چاہتا تھا کہ جنوبی افریقا کومن ویلتھ چھوڑ دے تو چھوڑ دے لیکن نسلی تفریق والی پالیسی ہرگز نہ چھوڑے۔

بیسویں صدی کو اس زمانے کے بعض فلسفیوں نے آزادی کا زمانہ قرار دیا تھا۔ یہ رائے غلط نہیں۔ اس زمانے کے لوگ ہر قسم کی بندشوں سے آزاد ہونے کی کوشش کر رہے تھے اور ان کی کوشش بڑی حد تک کامیاب تھی۔ چنانچہ محکوم قومیں صدیوں کی سیاسی غلامی سے آزاد ہو رہی تھیں۔ اچھوت قومیں مذہبی موانع سے برسر پیکار تھیں۔ جدید نسل سماجی جکڑ بندیوں کے خلاف بغاوت کر رہی تھی۔ اور جدید تر نسل جنسی آزادی حاصل کرنے کے لئے ہر قسم کی جنسی بے راہروی اختیار کر رہی تھی۔ نوجوانوں نے قبل از وقت جنسی تجربات کو اپنا پیدائشی حق سمجھ رکھا تھا جس کا نتیجہ یہ تھا کہ لڑکیاں بیوی بننے سے پہلے عورت بن جاتی تھیں۔ مردوں نے اس صورت حال سے اس بنیادی سمجھوتا کر لیا تھا کہ آخر وہ بھی تو شوہر بننے سے پہلے کتنے بچوں کے باپ بن جاتے ہیں۔

بیسویں صدی کے پہلے نصف حصے میں لوگوں پر مذہب کی گرفت خاصی تھی۔ خصوصاً غیر ترقی یافتہ ممالک میں جہاں علم اور عقل کی کمی نے مذہب کو استحصال کا ذریعہ بنا دیا تھا۔ عوام کی جہالت، مذہبی علما کے لئے ذریعۂ معاش کی حیثیت رکھتی تھی۔ بیسویں صدی کے دوسرے نصف حصے میں دنیا کی اکثریت مذہب کو پرانے زمانے کے توہمات میں شمار کرنے لگی تھی۔

جن ممالک میں مذہب سے تھوڑا سا تعلق باقی رہ گیا تھا وہاں بھی مذہبی عقائد میں بہت کچھ ترمیم اور عبادات میں بہت کچھ تخفیف ہو چکی تھی۔ لیکن یہ سوچ کر سخت تعجب ہوتا ہے کہ مذہب سے وابستہ رہنے والا گروہ اپنی ساری ترقی پسندی اور روشن خیالی کے باوجود یہ نکتہ کو نہ سمجھ سکا کہ مذہب کا اہم ترین حصّہ نہ عقائد ہیں نہ عبادات۔ مذہب کی روح اخلاقیات سے عبارت ہے اور اخلاقیات مذہب کا سہارا لئے بغیر اپنے پاؤں پر بھی کھڑی ہو سکتی ہے۔

بیسویں صدی میں سائنس کے علاوہ دوسرے علوم نے بھی زبردست ترقی کی تھی۔ یہ ترقی کہیں کہیں دو علم کے درمیان تصادم کا سبب بن گئی تھی۔ مثلاً نفسیات ہر مجرم کو مریض قرار دیتی تھی اور قانون اکثر مریضوں کو مجرم منوانے پر مصر رہتا تھا۔ ان علوم کی باہمی کشمکش اور لازمی شکست و فتح کا نتیجہ یہ تھا کہ بعض مجرموں کو شفاخانے بھیج دیا جاتا تھا اور بعض مریضوں کو قید خانے کی ہوا کھانا پڑتی تھی۔

بیسویں صدی میں سائنس کی حیرت انگیز ترقی کی بدولت آرام و آسائش کے وسائل تکلیف دہ حد تک بڑھ گئے تھے تعیشات کا شمار ضروریات میں ہونے لگا تھا اور ضروریات کے بارے میں وہ پرانا مقولہ غلط ثابت ہو چکا تھا کہ ضرورت ایجاد کی ماں ہے۔ اس زمانے میں ایجاد ضرورت کی ماں بن گئی تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ بیسویں صدی میں صرف ضرورت کی چیزیں ایجاد نہیں کی جاتی تھیں بلکہ خود نئی نئی ضرورتیں بھی ایجاد کی جاتی تھیں۔ انسان کی قوت ایجاد اس حد تک بڑھ گئی تھی کہ وہ زمین پر رہنے کی بجائے آسمان پر پہنچنے کی کوشش کرنے لگا تھا۔ اس کوشش کو دیکھ کر اس

دور کے بعض دانشوروں نے کہا تھا کہ جس مخلوق کو زمین پر رہنا نہیں آیا وہ آسمان پر کیونکر رہ سکے گی۔ تاریخی دستاویزات کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ اُس زمانے کی جو قومیں آسمان پر پہنچنے کی کوشش کر رہی تھیں ان کا مقصد آسمان پر رہنا اتنا نہ تھا جتنا قضیۂ زمین بر سرِ آسمان طے کرنا تھا۔

بیسویں صدی میں بہت سے ممالک ایسے بھی تھے جو ذہنی اور عملی طور پر زمانہ ماقبل تاریخ سے تعلق رکھتے تھے۔ ان ملکوں کے باشندوں کو تبدیلی اور ترقی سے سخت چڑ ھ تھی۔ انہیں اپنا ماضی اتنا عزیز تھا کہ وہ آگے بڑھنے کی بجائے پیچھے لوٹنے کو اصل زندگی سمجھتے تھے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ گردشِ ایام سے بھی ان کی فرمائش یہی تھی کہ "اے دوڑ پیچھے کی طرف اے گردش ایام تو۔" انہیں قدیم تہذیب کی لعنتیں جدید تہذیب کی برکتوں سے بہتر معلوم ہوتی تھیں۔ وہ مٹی کے دیئے کو بجلی کے قمقموں پر، بیل گاڑی کو ہوائی جہاز پر، دستکاری کو مشینی صنعت پر، کنوئیں کے پانی کو نل کے پانی پر، چکی کے آٹے کو مل کے آٹے پر، ہاتھ کی لکھی ہوئی تحریر کو ٹائپ کی ہوئی تحریر پر، توہم پرستی کو عقل پرستی پر، روایت کو تجربے پر، غرض کہ ہر پرانی چیز کو نئی چیز پر ترجیح دیتے تھے۔ اگر ایک زمانے سے دوسرے زمانے میں اپنے آپ کو منتقل کرنا ممکن ہوتا تو وہ لوگ یقیناً بیسویں صدی سے ہجرت کر کے بارہویں صدی میں چلے جاتے۔

جہاں تک شعر و ادب کا تعلق ہے یہ دور یورپ میں تجربے کا دور تھا اور ایشیا میں تقلید کا۔ ایشیا کا ہر وہ اہلِ قلم جینیئس مانا جاتا تھا جو کسی مغربی مصنف کی

تخلیقات کا جربہ اتار سکتا تھا۔ مغربی مصنفین کے فنی تجربات شعروادب کو فنون لطیفہ کی حدود سے نکال کر ریاضیات کی حدود میں لے آئے تھے۔ اس زمانے میں کسی نظم یا ناول کا ناقابل فہم ہونا بڑی خوبی تصور کیا جاتا تھا اور اشکال و ابہام کے جواز میں دلیل یہ پیش کی جاتی تھی کہ موجودہ زندگی اتنی پیچیدہ ہے کہ شعروادب میں اشکال و ابہام کا ہونا ناگزیر ہے۔ اس دلیل کو اس دور کے اکثر بڑے نقادوں کی حمایت حاصل تھی۔ اس زمانے کے عام قارئین اور ممتاز ناقدین میں فرق صرف اتنا تھا کہ قارئین ادبی اور شعری تخلیقات کے سمجھنے میں ناکام ہو کر جاسوسی ناول پڑھنے لگتے تھے اور ناقدین ان تخلیقات کو نہ سمجھنے کے باوجود اپنی سخن فہمی کا ثبوت دینے کے لئے ان تخلیقات پر تعریفی مضامین لکھتے رہتے تھے۔ اپنے بعض کمزور لمحات میں وہ اس بات کا اعتراف بھی کر لیتے تھے کہ اگرچہ فلاں نظم کا مفہوم سمجھنا مشکل (نقاد حضرات لفظ مشکل کو محال کے معنی میں بھی استعمال کرتے تھے) ہے مگر اس کی موسیقی میں غضب کی دلکشی ہے۔ ایک نقاد نے تو یہاں تک کہہ دیا تھا کہ شاعری سے لطف اندوز ہونے کے لئے اس کو سمجھنا ضروری نہیں۔ اس نظریے کا سہارا لے کر کئی شاعروں نے ایسی بھی نظمیں لکھ ڈالی تھیں جو خود ان کی سمجھ میں نہ آتی تھیں۔

بیسویں صدی کے ادب کی ایک خوبی ایسی ہے جس کا اعتراف نہ کرنا سخت ناانصافی ہوگی۔ وہ یہ کہ اس دور کے ادب اور زندگی میں بڑی مطابقت تھی۔ یعنی جس قدر عریانی اس دور کی زندگی میں تھی اسی قدر عریانی اس دور کے ادب میں

بھی تھی۔ حکومت اور معاشرہ دونوں زندگی کی عریانی کو تو روا رکھتے تھے لیکن ادب کی عریانی پیدا دیبوں کو سزا دیتے تھے۔ ادیب اپنی صفائی میں عموماً یہی عذر پیش کرتا تھا کہ اس کے ادب میں جو عریانی ملتی ہے وہ خود زندگی سے آئی ہے۔ یہ دلیل صحیح ہونے کے باوجود بے اثر ثابت ہوتی تھی کیونکہ کسی بھی معاشرے کو برے اعمال سے اتنی وحشت نہیں ہوتی جتنی برے اعمال کے بیان سے۔ کیا واقعی الفاظ اعمال سے زیادہ خطرناک ہوتے ہیں؟

بیسویں صدی کی تمام خصوصیات کو ایک مختصر سے مضمون میں سمیٹنا محال کو ممکن بنانے کے برابر ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ کوشش کامیاب ہونے سے رہی اس لئے میں نے طے کیا ہے کہ بیسویں صدی کی خصوصیات پر ایک مبسوط کتاب لکھوں جو بیس جلدوں پر مشتمل ہو اور ہر جلد میں کم از کم پانسو صفحات ہوں۔ مجھے ان بیس جلدوں میں جو کچھ کہنا ہے وہ نقطہ بہ نقطہ میرے ذہن میں موجود ہے۔ پھر بھی میں نے ابھی تک لکھنا شروع نہیں کیا ہے۔ خیال یہ ہے کہ پہلے کسی پبلشر کو بیس جلدوں کی طباعت پر آمادہ کرلوں تو کام شروع کردوں۔ اگر آپ کسی ایسے علم دوست اور حوصلہ مند پبلشر سے واقف ہوں تو براہ کرم مجھے اس کے پتے سے مطلع فرمائیں۔ ویسے بیسویں صدی سے بیالیسویں صدی تک کی علمی تاریخ یہی کہتی ہے کہ علم دوستی اور حوصلہ مندی سے پبلشروں کو تعلق نہ رہا ہے نہ رہے گا۔

۲۳ مارچ ۱۹۶۱ء

شہرت کی خاطر

دولت کی خاطر بعض لوگ چوری کرتے ہیں۔ شہرت کی خاطر میں نے سرقہ کرنا شروع کیا۔ کہیں سے موضوع، کہیں سے مواد، کہیں سے تشبیہیں، کہیں سے ترکیبیں، کہیں سے لہجہ، کہیں سے مصرع۔ کسی کا رنگ، کسی کا آہنگ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ میری شاعری میں ترجمے اور توارد کے عناصر زیادہ پائے جانے لگے اور ان عناصر کے پانے والوں نے مجھ پر تو نہیں لیکن میرے ایسوں پر بعض رسالوں میں دو چار دلا ورا ست دزدے کہ بکف چراغ دارد، کے عنوان سے قسط وار مضامین لکھنے شروع کر دیئے اور جو لوگ مضامین لکھنے کی صلاحیت سے محروم تھے وہ بعض ہفتہ وار رسالوں میں ایڈیٹروں کے نام کھلی چھٹی بھیجنے لگے۔ کھلی چھٹی میں جو رسوائی چھپی ہوئی تھی اس نے مجھے کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا۔ اور قبل اس کے کہ لوگ مجھ سے عبرت حاصل کریں میں نے لوگوں سے یعنی اپنے ہم مشرب اور ہم پیشہ لوگوں سے عبرت حاصل کر لی۔ نتیجتاً مجھ میں لکھنے کی ہوس تو باقی رہی سرقہ کرنے کا حوصلہ باقی نہ رہا۔

اب میرے سامنے مسئلہ یہ تھا کہ سرقہ کئے بغیر لکھنے کی صورت کیا ہو، لکھے بغیر چھپنے کی کون سی ترکیب نکالی جائے اور چھپے بغیر جینے کا کون سا سہارا اختیار کیا جائے۔ چونکہ میں کسی بھی مسئلے پر زیادہ دیر تک سوچنے کی صلاحیت نہیں رکھتا اس لئے تھوڑے سے غور و فکر کے بعد میں نے طے کر لیا کہ اب سرقہ کرنے کی بجائے کسی مشہور استاد کا شاگرد بن جاؤں۔ شہر میں ایسے استادوں کی کمی نہ تھی جن کی استادانہ عظمت کا دارومدار یا تو اس بات پر تھا کہ وہ کسی مرحوم استاد کے جانشین یا حاشیہ نشین تھے یا پھر اس بات پر کہ ان کے شاگردوں کی تعداد غیر معمولی تھی۔ چنانچہ میرے ایسے نااہل شاگرد کے لئے بھی کئی استادوں کے دروازے یا یوں سمجھئے کہ کھلنے کھلے ہوئے تھے۔ اس سلسلے میں میری نگہ انتخاب اُن صاحب پر پڑی جو اپنی کہنہ مشقی اور پُر گوئی دونوں کے لئے ممتاز تھے۔ ان سے میرے استفادے کا طریقہ یہ تھا کہ صبح کے وقت میں اپنی غزل ان کو دے آتا اور شام کے وقت ان کی اصلاح لے آتا۔ یہاں اصلاح شدہ غزل کی بجائے صرف اصلاح کا لفظ اس لئے استعمال کر رہا ہوں کہ استاد کی اصلاح کے بعد مجھے صرف ان کی اصلاح نظر آتی تھی۔ اپنی غزل کبھی نظر نہ آئی۔ لیکن اس صورت حال سے مجھے کوئی شکوہ نہ تھا کیونکہ میری اصل آرزو لکھنے سے زیادہ چھپنے کی تھی اور چھپنے کے لئے میرے پاس غزل کا ہونا کافی تھا۔ یہ سوال غیر متعلق تھا کہ وہ غزل کس حد تک میری تھی اور کس حد تک استاد کی۔ شاگرد بن جانے سے میرے دو بنیادی مسئلے حل ہو گئے۔ ایک تو غزل کی فراہمی دوسرے اس کی اشاعت۔ میری غزلیں پہلے بھی شائع ہو جاتی تھیں لیکن اب اشاعت کی آسان صورت یوں نکل آئی کہ دو چار رسالوں کے ایڈیٹر استاد کے جس قدر نیازمند تھے استاد اپنے کلام کی

اشاعت کی طرف سے اتنے ہی بے نیاز واقع ہوئے تھے۔ میں نے اس صورت حال سے فائدہ اٹھایا۔ استاد کے نام ایڈیٹروں کے خط آتے تو میں جواب میں استاد کی غزلوں کے ساتھ اپنی بھی غزل بھیج دیتا۔ چونکہ اردو رسالوں کے ایڈیٹر جوہر شناس کم اور مصلحت شناس زیادہ ہیں اس لئے وہ استاد کی غزلوں کے لئے میری بھی غزلیں شائع کر دیتے۔ جس پرچے میں میری غزل ہوتی اسے ایک یا دو ہفتے تک ہاتھ میں لئے پھرتا۔ ٹھیک اسی طرح جس طرح غالب کا رقیب اپنے مشترکہ محبوب کا خط لئے پھرتا تھا ؂

غیر پھرتا ہے لئے یوں ترے خط کو کہ اگر
کوئی پوچھے کہ یہ کیا ہے تو چھپائے نہ بنے

پرچہ ملنے کے بعد میری خواہش اور کوشش یہ ہوتی کہ کسی نہ کسی عنوان سے اپنے تمام جاننے والوں سے ملاقات ہو جائے۔ ملاقات کے دوران میں ملنے والا قدرتی طور پہ مجبور ہے پرچہ لے کر اس پر ایک سرسری نظر ڈال لیتا۔ کوئی میری غزل کی داد دیتا تو میں جواب میں کچھ اس قسم کی باتیں ضرور کہتا۔ ارے بھائی یہ غزل کا ہے کو ہے۔ ایڈیٹر کی مسلسل فرمائش کی تعمیل ہے اور بس۔ جہاں اس قسم کی خاکساری برتتا وہاں اس کی تلافی خودستائی سے کر دیتا۔ مگر میری خودستائی ہمیشہ بالواسطہ ہوتی۔ مثلاً آج فلاں جگہ سے واپس آ رہا تھا تو راستے میں ایک اجنبی بڑے تپاک سے ملا اور کہنے لگا آپ تو مجھے نہیں جانتے لیکن میں آپ کو جانتا ہوں۔ رسالوں میں آپ کا کلام دیکھتا رہا ہوں۔ آپ کی تصویر بھی دیکھی تھی۔ ایک زمانے سے آپ کا نیازمند ہوں۔ مجھے دورِ حاضر کے دو ہی شاعروں کا کلام پسند

آتا ہے۔ ایک تو جگر مراد آبادی کا۔ دوسرے آپ کا۔ اس قسم کے افسانے میں ان شاعروں کو ضرور سناتا جنہیں میں شاعری میں اپنا حریف سمجھتا تھا۔ موقع پاکر یا نکال میں ہمیشہ ان کو بتاتا رہتا کہ فلاں جگہ فلاں اشخاص کے درمیان میرا اور تمہارا تذکرہ ہو رہا تھا اور اس تذکرے میں سب لوگ میری برتری پر متفق تھے۔ میرے نزدیک خود ستائی کا محفوظ ترین طریقہ یہی ہے کہ بات خلق خدا کے حوالے سے کہی جائے تاکہ عذاب راوی کی گردن پر جائے اور ثواب اپنے حصے میں آئے۔

مشاعرے کی طرف سے میں کبھی غافل نہ رہتا۔ یہ اور بات ہے کہ شہر کے بعض بڑے مشاعرے یا ریڈیو پاکستان کے مشاعرے مجھ سے غافل گذر جاتے۔ ایسے مشاعروں کا اعلان سنتے ہی میں اپنے آپ کو مدعو کرانے کی کوشش شروع کر دیتا۔ مشاعرے کے منتظمین سے ہر تیسرے دن کسی نہ کسی بہانے مل لیتا۔ کسی ہوٹل کے قریب ان سے ملاقات ہو جاتی تو ان کی تمام مصروفیات کے باوجود انہیں ہوٹل میں کھینچ لے جاتا۔ چائے پلاتا۔ سگریٹ پیش کرتا۔ ان کے پچھلے مشاعرے میں اپنے نہ بلائے جانے پر شاکی ہونے کے باوجود اس کی شاندار کامیابی کا تذکرہ چھیڑ دیتا۔ وہ لوگ خوب سمجھتے کہ اس خاطر مدارات کا محرک کیا ہے۔ اس لئے اپنے مشاعرے اور میری شاعری دونوں سے بچ کر کوئی تیسرا موضوع گفتگو ڈھونڈھنے کی کوشش کرتے۔ میں بار بار انہیں مشاعرے کے موضوع پر کھینچ لاتا۔ تو اور سنائیے۔ آج کل مشاعرے کے سلسلے میں کیا کیا مصروفیتیں ہیں۔ مقامی شاعروں کے نام دعوت نامے بھیجے جا رہے ہیں؟ جواب میں وہ کہتے۔

ارے صاحب، مصروفیتوں کا حال نہ پوچھیے۔ آدھے سے زیادہ کام باقی پڑے ہیں۔ مجلس عاملہ نے ابھی تک یہ بھی طے نہیں کیا کہ مقامی شاعروں میں کن لوگوں کو مدعو کرنا ہے۔

اس جواب میں میرے لیے مایوسی کا جو پیغام تھا اسے وصول کرنے کے باوجود میں آس لگائے رہتا کہ شاید میرے نام بھی مشاعرے کا دعوت نامہ آجائے۔ لیکن جب مشاعرے کا دن آجاتا اور دعوت نامہ نہ آتا تو میں فرضی ناموں سے مقامی اخباروں کے ایڈیٹروں کے نام خط لکھنے بیٹھ جاتا۔ خلاصۂ فریاد یہ ہوتا کہ فلاں انجمن نے جو مشاعرہ کیا یا ریڈیو پاکستان سے جو مشاعرہ نشر ہوا اس کا نہایت افسوسناک پہلو یہ ہے کہ اس میں بعض ایسے مبتدی شعرا مدعو تھے جو مدعو کیے جانے کے مستحق نہ تھے اور بعض ایسے شعرا نظر انداز کر دیئے گئے تھے جن کے بغیر نہ صرف ڈھاکا بلکہ مشرقی پاکستان کا کوئی مشاعرہ مکمل نہیں کہا جا سکتا۔ موخر الذکر شعرا میں اپنا نام سرفہرست ہوتا۔ اس قسم کی ہنگامہ آرائی خصوصیت کے ساتھ ریڈیو والوں کے حق میں عذاب جان ثابت ہوتی۔ انہیں ہر اس کوتاہی کے لیے جس کا الزام ان پر لگایا جاتا مرکزی دفتر کے سامنے جواب دہ ہونا پڑتا۔ بہر حال دو چار سال اس قسم کا ہنگامہ برپا کرنے سے مجھے اتنا فائدہ ضرور پہنچا کہ میں شہر کے بڑے مشاعروں میں بھی مدعو کیا جانے لگا اور ریڈیو والوں نے بھی مجھے نظر انداز کرنے کی عادت ترک کر دی۔

جب شہر کی ادبی انجمنوں اور ریڈیو والوں نے میری طرف اپنا رویہ بدلا تو میں نے بھی ان کی طرف اپنے رویے میں ترمیم کرلی۔ مثلاً اب اگر ریڈیو والوں نے مشاعرہ کیا تو محض اس بنا پر کہ میں بھی مدعو تھا میں اس کے خلاف اخباروں میں فرضی ناموں سے شکایت نامے چھپوانے کی بجائے اسٹیشن ڈائرکٹر کے نام مبارکباد کے خطوط بھیج دیتا۔ اس سلسلے میں میرا اصول یا معمول یہ تھا کہ مشاعرے کے دوسرے روز ڈاک خانے پہنچتا۔ دس پندرہ پوسٹ کارڈ خریدتا۔ کچھ خود لکھتا۔ کچھ دوستوں سے لکھواتا اور کچھ جان پہچان کے طالب علموں سے۔ ان خطوط کی عبارت مختلف ہوتی مگر نفس مضمون ایک ہی ہوتا۔ وہ یہ کہ رات ریڈیو پر آپ کا مشاعرہ سنا۔ اس سے پہلے آپ کے یہاں سے اتنا اچھا مشاعرہ سننے میں نہیں آیا تھا۔ آپ کو شاعروں کے انتخاب پر اور شاعروں کو اپنے کلام کے انتخاب پر جس قدر داد دی جائے کم ہے۔ یوں تو تمام شاعروں نے اچھی چیزیں اچھی طرح پڑھیں لیکن مجھے خصوصیت کے ساتھ حضرت بیتاب صبر آبادی کا کلام اور ان کے پڑھنے کا انداز بہت پسند آیا۔ امید ہے کہ آئندہ بھی آپ اپنے سامعین کو ان کے کلام سے محروم نہ ہونے دیں گے۔ جب ریڈیو والوں کو میرے بارے میں ایسے تعریفی کلمات موصول ہوتے تو وہ یہ مژدہ مجھے سناتے۔ لیکن میں نے ہمیشہ دیکھا کہ مجھے میری مقبولیت کی خوش خبری سناتے وقت ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ ضرور رہتی۔ خدا کرے ان کی مسکراہٹ کا مفہوم وہ نہ ہو جس کا مجھے اندیشہ رہا ہے۔

ریڈیو کے مشاعرے میں مدعو ہونا یقیناً ایک بڑی مہم تھی۔ لیکن میں نے محسوس کیا کہ شہرت کے لئے صرف اس مہم کو سر کرنا کافی نہیں۔ خصوصاً اس لئے کہ ریڈیائی مشاعرے بڑے طویل وقفوں پر ہوا کرتے ہیں۔ سال میں مشکل سے دو تین مرتبہ۔ اس لئے مجھے خیال آیا کہ ریڈیو کے عام پروگرام حاصل کرنے کی کوشش کیوں نہ کی جائے۔ اس کے لئے پروگرام اسسٹنٹ کے خلاف اخباروں میں خطوط لکھنے کی بجائے اس کی خوشامد کرنا زیادہ مناسب معلوم ہوا۔ شہرت کی خاطر مجھے اس کام سے کبھی عار نہ تھا۔ پہلے تو پروگرام اسسٹنٹ ہزار طریقے سے مجھے ٹالتا رہا۔ لیکن جب اس نے دیکھا کہ یہ فقیر کچھ لئے بغیر ٹلنے کا نہیں تو میرے محاصرے سے عاجز آکر کبھی کبھار ایک آدھ پروگرام دینے لگا۔ بعض اوقات اس کی شرارت یہ ہوتی کہ موضوع کے اعتبار سے نہایت مشکل ٹوک (Talk) مجھے دیتا اس امید میں کہ شاید میں اسے لینے سے انکار کر دوں اور اس میں شک نہیں کہ اگر میرے دوستوں میں محسن صاحب نہ ہوتے تو مجھے انکار کرتے ہی بنتی۔ لیکن ان کے ہوتے ہوئے انکار کرنے کی کوئی وجہ نہ تھی۔ محسن صاحب کی شرافت اور لیاقت دونوں سے جتنا اور جیسا فائدہ مجھے پہنچا ہے اتنا اور ویسا فائدہ شاید ہی کسی اور کو پہنچا ہو۔ کئی مرتبہ میرے اصرار سے انہوں نے میری ٹوک لکھ دی۔ لیکن جب وہ اس بدگار سے تنگ آکر مجھ سے معذرت کرنے لگے تو مجھے بڑے تردد کا سامنا کرنا پڑا۔ خیر اس تردد سے نجات پانے کی ایک ترکیب فوراً سمجھ میں آگئی۔ چونکہ

محسن صاحب اپنی تمام صلاحیتوں کے باوجود مفلوک الحال اور کثیر العیال ہیں اسلئے میں انہیں اس بات پر راضی کرنے میں کامیاب ہوگیا کہ ٹونک کا جو معاوضہ ریڈیو سے مجھے ملتا ہے اسے وہ قبول کرلیں اور ٹونک سے جو شہرت ہوسکتی ہے اس پر میں قناعت کروں۔ چنانچہ ایک عرصے تک میں اس قسم کی قناعت سے کام لیتا رہا۔

شہرت کی خاطر میرے دل میں اس بات کی بڑی تمنا رہا کرتی کہ کاش کوئی شخص میرے اعزاز میں بزم سخن منعقد کرتا اور دوسرے روز اخبار میں اس کی روداد شائع ہوتی۔ جب اپنے مقامی دوستوں کے ہاتھوں میری یہ تمنا پوری نہ ہوسکی تو میں نے کسی دوسرے شہر سے کسی شاعر کے آنے پر اس کے اعزاز میں اپنے یہاں بزم سخن منعقد کرنا شروع کردی تاکہ جب میں اس کے شہر میں جاؤں تو وہ میرے اعزاز میں کچھ کرے۔ لیکن یہ ترکیب کارگر نہ ہوئی۔ میں کسی دوسرے شہر میں جاتا تو وہاں میرے شاعر احباب میری خاطر مدارات ضرور کرتے لیکن میرے اعزاز میں کوئی نشست کرنے پر آمادہ نظر نہ آتے۔ بالآخر میں خود تحریک کرنے لگا۔ اپنے میزبان سے کہتا۔ ارے بھائی ایک مدت کے بعد تمہارے شہر میں آیا ہوں۔ کیا اچھا ہوتا کہ اپنے شہر کے چند شاعروں کا کلام سنوا دیتے۔ کیوں نہ آج شام کے وقت دو چار شاعروں کو چائے پر مدعو کرلو۔ دلچسپ صحبت رہے گی۔ اور جب اس قسم کی صحبت ہوجاتی تو میں پھر اپنے میزبان سے کہتا۔

والله آج تو بڑی اچھی نشست ہو گئی۔ کیوں نہ اس کی روداد اخبار میں شائع کرا دی جائے۔ اگر تمہیں لکھنے میں زحمت ہو تو میں ہی لکھ کے بھیج دوں۔ یہ کہہ کر میں قلم کاغذ لے کر بیٹھ جاتا۔ روداد کا عنوان یہ ہوتا۔ "حضرت بنیاب صبر آبادی کے اعزاز میں نشست"۔ شرکائے مجلس میں اُن شاعروں کے بھی نام ہوتے جو اس مجلس میں شریک نہ تھے تاکہ عوام یہ نہ سمجھیں کہ میرے اعزاز میں جو نشست ہوئی تھی وہ کچھ یونہی سی تھی۔ اب تک میرے اعزاز میں جتنے مشاعرے ہوئے ہیں ان کا محرک اور ان کی جو رپورٹیں شائع ہوئی ہیں ان کا رپورٹر میں ہی رہا ہوں۔

چونکہ میری زندگی کا سب سے بڑا مقصد شہرت حاصل کرنا تھا اس لئے مجھے ضروری معلوم ہوا کہ شہر کی تمام ادبی انجمنوں سے تعلق رکھوں ـــــــ اُن ادبی انجمنوں سے بھی جن کا طریق کار مجھے پسند نہ تھا اور جہاں میری آؤ بھگت بالکل نہ ہوتی۔ سچ پوچھیے تو سنجیدہ علمی اور ادبی حلقوں میں میری وقعت تھی ہی نہیں۔ اس کمی کو محسوس کرتے ہوئے میں نے شہر کے جاہل شاعروں اور افسانہ نگاروں سے دوستی گانٹھ رکھی تھی۔ چونکہ ان سب میں میں ہی سب سے زیادہ تعلیم یافتہ آدمی تھا اور اپنی ایم اے کی ڈگری کے سہارے ایک مقامی کالج میں پروفیسر بھی تھا اس لئے مجھے اس جماعت کا امام بنتے دیر نہ لگی۔ دراصل میں ان کا امام ہی نہیں استاد بھی تھا۔ اپنی سمجھ کے مطابق ان شاعروں کی شاعری اور افسانہ نگاروں کے افسانوں پر جہاں تہاں اصلاح دے دیا کرتا تھا۔ اس جماعت کے تمام اراکین

مجھے بیتاب صبر آبادی کہنے کی بجائے ازراہ احترام و عقیدت صرف پروفیسر صاحب کرتے تھے۔ ان کے اس احترام و عقیدت کی قیمت میں اس طرح بھی ادا کرتا تھا کہ جب کبھی کسی رسالے یا اخبار کے لیے اپنے شہر کے ادیبوں اور شاعروں پر مضمون لکھتا (میں اس موضوع پر اکثر لکھا کرتا) تو اس میں اپنے مریدوں کو شہر کے سب سے ممتاز ادیبوں اور شاعروں کی حیثیت سے پیش کرتا۔ اور جو فی الواقع ممتاز ادیب اور شاعر تھے انہیں اپنی فہرست کے نچلے حصے میں کہیں جگہ دیدیتا۔ اور ان میں جن لوگوں سے مجھے خاص طور پر کدہوتی ان کا تو سرے سے نام ہی نہ لیتا۔ یہ بات یقیناً انصاف سے بعید ہے لیکن اب اس کا کیا علاج کہ یہی بات اور اسی قسم کی باتیں شہرت تک پہنچنے کے لیے short cut کی حیثیت رکھتی ہیں۔

جیسا کہ میں نے ابھی کہا شہرت کی خاطر میں ان انجمنوں سے بھی وابستہ تھا جن کا طریق کار مجھے پسند نہ تھا۔ مثلاً حلقہ ارباب علم۔ اس انجمن کے ہفتہ وار جلسوں میں جو چیزیں پڑھی جاتی تھیں ان کی خوبیوں کی داد دینے کی بجائے ان کی خامیوں کو بھری محفل میں بے نقاب کیا جاتا تھا تاکہ لکھنے والے یا تو لکھنے سے باز آئیں یا غلطیوں سے باز آئیں۔ میں حتیٰ الامکان اس انجمن کے جلسوں میں پڑھنے سے پہلو تہی کرتا۔ لیکن کبھی نہ کبھی پڑھنا ہی پڑتا۔ ایک مرتبہ میں نے غزل پڑھی۔ اس پر تنقید کرتے ہوئے ایک بدتمیز نوجوان نے اس میں کئی نقص نکالے۔

مجھے اس کی تنقیص پر طیش آگیا۔ جلسہ ختم ہوتے ہی میں نے کہا کہ اگر فلاں صاحب اس قسم کی تنقید کریں گے تو میں انہیں ٹھیک کر دوں گا۔ اس پر ایک مسخرا مجھ سے سوال کر بیٹھا کہ بالفرض آپ نے فلاں صاحب کو ٹھیک کر دیا تو کیا اس سے آپکی غزل ٹھیک ہو جائے گی۔ اس سوال پر سب لوگ ہنس پڑے اور سب کے ساتھ میں بھی ہنس پڑا۔ لیکن بعد میں مجھے محسوس ہوا کہ یہ سوال اس نوجوان کی تنقیص سے بھی زیادہ ہتک آمیز تھا۔ بہر حال اسے پینے ہی بنی۔ گم نام لوگ کیا جانیں کہ شہرت حاصل کرنے والوں کو شہرت کی خاطر کیسے کیسے تلخ بے پینے پڑتے ہیں۔

ایک دن بیٹھے بیٹھے خیال آیا کہ اگر دور حاضر کے کسی بڑے شاعر پر معترضانہ تنقید جڑ دوں تو ممکن ہے اس سے ادبی حلقوں میں کچھ شورش پیدا ہو اور اس شورش کی بدولت میری شہرت میں کسی قدر اضافہ ہو جائے۔ مجھے اس کا احساس تھا کہ میں تنقید نہیں لکھ سکتا۔ کسی کے کلام پر صحیح اعتراض بھی نہیں کر سکتا۔ لیکن میں اتنا بھی گیا گذرا نہ تھا کہ کسی کی شاعری کے متعلق اوٹ پٹانگ باتیں بھی نہ لکھ سکوں۔ چنانچہ میں نے دور حاضر کے ممتاز شاعروں میں سے ایک کو اپنا موضوع بنا کر مضمون لکھنا شروع کر دیا۔ اس کی اشاعت کے متعلق مجھے زیادہ فکر نہ تھی کیونکہ اتنی بات میرے ایسے کم علم آدمی کو بھی معلوم تھی کہ اردو کے بہت سے رسالوں اور ردی کی ٹوکری میں کوئی فرق نہیں ہے۔ جب میرا مضمون مکمل ہو گیا تو میں نے اسے ردی کی ٹوکری میں ڈالنے کی

بجائے ایک رسالے کے پاس بھیج دیا جس میں حسب توقع وہ شائع بھی ہو گیا۔ اس مضمون کی اشاعت کا نتیجہ میرے اندازے سے مختلف نہ تھا ادبی حلقوں میں چہ میگوئیاں شروع ہو گئیں۔ کتنا لغو مضمون ہے۔ سارے اعتراضات جاہلانہ ہیں۔ یہ مضمون تو اس قابل بھی نہیں کہ اس کا جواب دیا جائے۔ لیکن اس ردعمل کے باوجود میرے اعتراضات کے جواب چھپنے لگے۔ کچھ شاعروں کے مداحوں کی طرف سے۔ کچھ اس کے شاگردوں کی طرف سے۔ کچھ اس رسالے میں جس میں میرا مضمون شائع ہوا تھا اور کچھ دوسرے رسالوں میں۔ جوابات سارے کے سارے صحیح تھے۔ لیکن مجھے ان کے صحیح اور غلط ہونے سے کوئی سروکار نہ تھا۔ میرے لئے اتنا ہی کافی تھا کہ ع

ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ ہر محفل میں ہے

ہر محفل یعنی ہر رسالے میں اپنا ذکر دیکھ کر میں اپنی روح میں جو بالیدگی محسوس کرتا ہوں اسے بیان نہیں کر سکتا۔ اس روحانی بالیدگی کے لئے ضروری تھا کہ میں رسالوں میں برابر مضامین لکھتا رہتا۔ لیکن چونکہ ہر مہینے مضمون لکھنا ممکن نہیں اس لئے میں نے مضمون کی بجائے ایڈیٹروں کے نام خطوط لکھنے کا سلسلہ شروع کر دیا ـــــ اُن ایڈیٹروں کے نام جن کے رسالوں میں قارئین کے خطوط شائع ہوتے ہیں۔ ایسے ایڈیٹروں کا اصول یہ رہا ہے کہ خود وہ اور ان کا رسالہ کتنے ہی گھٹیا کیوں نہ ہوں لیکن ان کی اور ان کے رسالے کی تعریف میں

جتنے خطوط آئیں گے وہ ضرور شائع کیے جائیں گے۔ میں ایڈیٹروں کے نام خط لکھتے وقت اُن کی اس نفسیات کا بڑا لحاظ رکھتا۔ جس رسالے کے بارے میں میری اصلی رائے یہ ہوتی کہ اتنا واہیات۔ رسالہ ہرگز جاری نہ کرنا چاہیے تھا اس کے بارے میں ایڈیٹر کو یہ لکھتا کہ آپ نے یہ رسالہ نکال کر ایک بڑی کمی پوری کردی ہے۔ جس ایڈیٹر کے بارے میں میری حقیقی رائے یہ ہوتی کہ ان کی ذات والا صفات ایڈیٹری سے زیادہ گھاس کاٹنے کے لیے موزوں ہے ان کو یہ لکھتا کہ آپ جیسے تجربہ کار ایڈیٹر کی ادارت میں کسی رسالے کا نکلنا اس کی کامیابی کی ضمانت ہے۔ ایڈیٹروں کو میرے ان خطوط میں بڑا خلوص نظر آتا جس کا وہ تہہ دل سے شکریہ ادا کرنے۔ شروع شروع میں جس ضرورت نے مجھے ایڈیٹروں کے نام خطوط لکھنے پر مائل کیا بعد میں وہ عادت بن کر رہ گئی۔ اس عادت کی بدولت میں نے اس کثرت سے ایڈیٹروں کے نام خطوط لکھے کہ بعض احباب مجھے پاکستان کا سب سے بڑا مکتوب نگار تصور کرنے لگے۔ ایک دوست کا تو یہاں تک خیال ہے کہ مکاتیب بنام مدیران رسائل، کو ادب کی ایک الگ صنف شمار کرنا چاہیئے اور مجھے اس صنف کا موجد تو نہیں لیکن سب سے بڑا نمائندہ قرار دینا چاہیئے۔

وہ جو کہا جاتا ہے کہ خدا شکر خورے کو شکر دیتا ہے سو غلط نہیں۔ کم از کم میں اس قول کی صحت کا بڑا قائل ہوں۔ اپنی شہرت کے لیے بہت سے وسیلے تو میں نے خود پیدا کیے اور بعض وسیلے اتفاقات نے فراہم کر دیے۔ مثلاً ایک مرتبہ

ہمارے شہر میں بہت بڑی اردو کانفرنس منعقد ہوئی۔ اس میں پاکستان کے تقریباً تمام ممتاز ارباب قلم مدعو کیے گئے تھے۔ ان ارباب قلم میں شاعر بھی تھے اور افسانہ نگار بھی۔ ناول نگار بھی تھے اور ڈرامانگار بھی۔ ایڈیٹر بھی تھے اور نقاد بھی۔ خیال آیا کہ اگر ان سب لوگوں کو اپنے یہاں کھانے پر مدعو کرلوں تو اس سے دو فائدے ہوں گے۔ ایک تو اپنے شہر میں اس بات کی شہرت ہوگی کہ میں اتنے ممتاز لوگوں کا میزبان بنا۔ دوسرے اس میزبانی کی بدولت جو رابطے قائم ہوں گے وہ آئندہ کام آتے رہیں گے۔ لیکن جب بیوی اور بجٹ دونوں میں سے کسی نے اتنی بڑی دعوت کے انتظام کی اجازت نہیں دی تو مجبوراً یہ طے کرنا پڑا کہ صرف چند آدمیوں کی دعوت پر اکتفا کی جائے۔ اب سوال انتخاب کا تھا۔ لیکن اس میں مجھے کسی دشواری سے دوچار نہ ہونا پڑا۔ میں نے اپنے آئندہ فوائد پر نظر رکھتے ہوئے صرف ایڈیٹروں اور نقادوں کو مدعو کرلیا۔ اس دعوت کے بعد بعض نقادوں کے مضامین میں اخلاقاً ہی سہی میرا بھی ذکر خیر آنے لگا اور میرا کلام ان رسالوں میں بھی شائع ہونے لگا جن میں پہلے کبھی شائع نہ ہوا تھا۔

شہرت کی خاطر میں نے انجمن سازی اور رسالہ بازی کے کاروبار میں بھی جی کھول کر حصہ لیا۔ پہلے تو کوئی بنی بنائی انجمنوں کا ممبر بنتا رہا۔ بعد میں خود میں نے یکے بعد دیگرے کئی انجمنیں، بنائیں۔ جو انجمن میں بناتا اس کا صدر یا سکریٹری خود میں ہوتا۔ سکریٹری اس حالت میں جب صدر کا عہدہ نہ ہوتا۔ میری انجمنوں کے

ظاہری اغراض و مقاصد میں علم و ادب کی خدمت سے کہ بین الاقوامی بھائی
چارگی کی تبلیغ تک سبھی کچھ شامل ہوتا۔ لیکن باطنی غرض و غایت ایک ہی ہوتی۔
تحسین باہمی کے ذریعے شہرت کی فراہمی ـــــ بہرحال اس دھندے میں عمر عزیز
کے پندرہ سال صرف کرنے کا فائدہ یہ پہنچا کہ میری قائم کی ہوئی انجمنِ انسانیت
پسند مصنفین کو حکومت کی طرف سے کچھ امداد مل گئی اور میں نے اس امداد کے
سہارے ایک سہ ماہی رسالہ نکال ڈالا۔ میرے خیال میں شہرت حاصل کرنے
کے لئے رسالہ نکالنا اور نقاد بننا نہایت ضروری ہے۔ جب تک وہ سہ ماہی
رسالہ میری ادارت میں چھپتا رہا غزلوں کے حصے میں سب سے پہلے میری غزلیں
مضامین کے حصے میں سب سے پہلے میرے مضامین اور تبصروں کے حصے میں سب
سے پہلے میرے تبصرے چھپتے رہے۔ میرے پالے ہوئے نقاد تو اپنے مضامین
میں میری تعریف کرتے ہی تھے میں نے دیکھا کہ ملک کے بعض دوسرے نقاد بھی
جب کبھی میرے رسالے میں کوئی مضمون بھیجتے تو اس میں موضوع کی مناسبت
سے میری تخلیقات کا حوالہ ضرور دیتے۔ اس سلسلے میں ایک واقعہ کا تذکرہ دلچسپی
سے خالی نہ ہوگا۔ ایک مرتبہ ایک نہایت مشہور نقاد نے سال بھر کے ادب کا جائزہ
لکھ کر اشاعت کی غرض سے میرے پاس بھیجا۔ اس مقالے کا ایک صفحہ میری تعریف
میں بھی تھا۔ لیکن اس مقالے کے کچھ حصے ایسے بھی تھے جن کو بعض وجوہ کی بنا پر
میں اپنے رسالے میں شائع کرنے سے معذور تھا۔ میں نے نقاد موصوف سے ترمیم

کی درخواست کی۔ وہ اس پر راضی نہ ہوئے اور انہوں نے اپنا مقالہ واپس منگوا لیا۔ کچھ عرصے کے بعد وہ مقالہ ایک دوسرے رسالہ میں چھپا۔ میں نے بڑے اشتیاق بلکہ بڑی بیتابی سے اپنی تعریف والا صفحہ ڈھونڈھنا شروع کیا۔ دیکھتا کیا ہوں کہ میری تعریف میں جو کلمات تھے وہ تو بجنسہ موجود ہیں لیکن میرے نام کی جگہ اس ایڈیٹر کے نام نے لے لی ہے جس کے رسالے میں وہ مضمون چھپا تھا۔ یعنی مدح وہی تھا ممدوح بدل چکا تھا۔

جب رسالہ نکالنے کی سہولتیں میسر آئیں تو خیال آیا کہ اب کیوں نہ اپنے کلام کا ایک مجموعہ بھی شائع کر دیا جائے۔ اپنے مجموعۂ کلام کی طباعت کے لئے تو میں پہلے ہی سے بے چین تھا۔ چنانچہ اس چکر میں اپنے دو سو روپے بھی ضائع کر چکا تھا۔ وہ یوں کہ ایک نئے طباعتی ادارے نے جس کے کرتا دھرتا خود بھی شاعر ہیں اس شرط پر میری کتاب چھاپنے کا وعدہ کیا کہ دو سو روپے میں دوں اور باقی اخراجات ادارے کے ذمے۔ لیکن روپیہ لینے کے بعد شاعر موصوف نے اپنا مجموعۂ کلام شائع کر لیا اور مجھے وعدے وعید پر ٹرخاتے رہے۔ خیر ان سے خدا سمجھے۔ میں نے اپنے رسالے کا اجرا کرتے ہی اپنی کتاب کا اشتہار دینا شروع کر دیا۔ کتاب کے اشتہار سے بھی شہرت میں خاصا اضافہ ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض اہل قلم کتاب لکھنے سے پہلے ہی اس کے زیر طبع ہونے کا اشتہار دینا شروع کر دیتے ہیں۔ بعض تو صرف اشتہار ہی دیتے ہیں۔ کتاب کبھی نہیں لکھتے۔ لیکن میں

نے ایسا نہیں کیا۔ صرف تین سال تک اشتہار دیتا رہا جس کا مضمون یہ تھا کہ "اگر آپ حافظ کی سرمستی، میر کا سوز و گداز، غالب کی فکر، حالی کا خلوص اقبال کی دردمندی، جگر کی نزاکت احساس، فراق کی ژرف بینی اور فیض کی تازہ کاری ان تمام عناصر کو یکجا دیکھنا چاہتے ہیں تو اپنی اولین فرصت میں حضرت بیتاب صبر آبادی کے مجموعۂ کلام "بربط و نے" کے لیے پیشگی آرڈر بھیج دیں۔" تین سال تک اشتہار دینے کے بعد اپنی عملی دشواریوں پر قابو پا کر میں نے اپنا مجموعۂ کلام شائع کر ڈالا۔ شہرت عام اور بقائے دوام کے لیے میں نے اس کتاب پر مشہور ادیبوں اور نقادوں سے تعارف، تمہید، تقریظ، دیباچہ، پیش لفظ غرض کہ اس قبیل کی جتنی چیزیں ہوتی ہیں سب لکھوا ڈالیں جن سے میری کتاب کے حجم کو خاطر خواہ فائدہ پہنچا۔ اگر تعارف اور تمہید وغیرہ ساٹھ صفحوں کو محیط نہ ہوتے تو میری کتاب پچاس صفحے سے آگے نہ بڑھتی۔ لیکن ان پچاس صفحوں میں صرف غزلیں نہ تھیں۔ میں نے اپنی شاعری میں زمانے کی مانگ پر ہمیشہ نظر رکھی۔ جس دور میں جو صنف اور طرز مقبول ہوئی اس میں کچھ نہ کچھ ضرور لکھ ڈالا۔ چنانچہ میرے مجموعۂ کلام میں غزلیں دوہے، گیت سبھی کچھ تھے۔ سبھی کچھ میں غزلیں بہ طرزِ میر اور نظمیں بہ طرزِ نثر بھی شامل ہیں۔

حصول شہرت کے جتنے نسخے میرے ہاتھ آئے وہ سب میں نے آزما دیکھے

ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ میں نے تمام عمر لکھنے کی آتی کوشش نہیں کی ہے جتنی شہرت حاصل کرنے کی۔ میری کوششیں سرتاسر رائگاں نہیں گئی ہیں۔ لیکن ان کا نتیجہ حسب دل خواہ بھی نہیں ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ پاکستان اور ہندوستان جیسے ممالک میں ادیبوں اور شاعروں کی شہرت مرنے کے بعد ہوتی ہے۔ ان ملکوں کے باشندے اپنے ادیبوں اور شاعروں کو ان کی زندگی میں نہ پوچھتے ہیں نہ پوچھتے ہیں۔ ان ممالک کی مردہ پرستی ہی کے پیش نظر یگانہ چنگیزی کو وہ کام کرنا پڑا جس کی طرف انہوں نے یوں اشارہ کیا ہے ؎

الٹی کھتی مت زمانۂ مردہ پرست کی
میں ایک ہوشیار کہ زندہ ہی گڑ گیا

حصول شہرت کا یہی ایک نسخہ ایسا ہے جس پر اب تک میں عمل نہ کر سکا ہوں۔ ممکن ہے یہ نسخہ بالکل تیر بہدف ہو لیکن زندہ گڑ جانے کے تصور ہی سے مجھ پر لرزہ سا طاری ہونے لگتا ہے۔

۲ مارچ ۱۹۶۰ء

نظیر صدیقی کی دوسری تصانیف

۱۔ امید (ترجمہ) ایک پاکستانی سفیر کی آپ بیتی جو انگریزی سے اردو میں منتقل کی گئی۔ مطبوعہ مکتبۂ کارواں ایبک روڈ انارکلی۔ لاہور

۲۔ تاثرات و تعصبات (زیرِ طبع) اُن تنقیدی مضامین کا مجموعہ جو پاکستان اور ہندوستان کے مشہور و ممتاز رسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔

۳۔ عندلیب شادانی (زیرِ ترتیب) یہ کتاب ڈاکٹر عندلیب شادانی کے حالاتِ زندگی اور ان کی ادبی خدمات کے تنقیدی جائزے پر مشتمل ہے۔

۴۔ اردو ادب ـــــ بیسویں صدی میں (زیرِ ترتیب)

۵۔ حرفِ پریشان (زیرِ ترتیب) مجموعۂ کلام

ہماری دوسری کتابیں

۱۔ اردو زبان کا ارتقا — ڈاکٹر شوکت سبزواری

قیمت — سات روپے پچاس پیسے

۲۔ علم بلاغت اور علم عروض — پروفیسر نظیر صدیقی

قیمت — دو روپے

۳۔ سلیقۂ تحریر — پروفیسر نظیر صدیقی

و

مولوی عبدالرشید خاں

قیمت — تین روپے